محمود المواعظ

(جلد اول)

مجموعۂ مواعظ

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم
سابق صدر مفتی وحال شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل

ناشر

مکتبۂ محمودیہ، محمود نگر، ڈابھیل

تفصیلات

کتاب کا نام: .... محمود المواعظ (جلد اول)

مواعظ: .... حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

بہ اہتمام: .... خدّام حضرت اقدس دامت برکاتہم

صفحات: ۳۴۰

ناشر: .... مکتبۂ محمودیہ، محمودنگر، ڈابھیل، گجرات

ملنے کے پتے

- ادارۃ الصدیق ڈابھیل، نزد جامعہ ڈابھیل، Mo:99133,19190
- شعبۂ فیض محمود، سورت، Mo: 99988,31838
- مکتبہ محمدیہ (مفتی سلیمان شاہوی) ترکیسر Mo:88666,21229
- مکتبۂ انور (مفتی عبدالقیوم راجکوٹی) ڈابھیل Mo:99246,93470
- مکتبۂ ادب جمبوسر، Mo:98987,55200
- مکتبۃ الاتحاد دیوبند Mo:98972,96985
- مولانا رحمت اللہ صاحب مدظلہ (دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر)
- مولانا بک ڈپو، رانی تالاب، سورت، Mo: 92287,60716

بضاعت نیاوردم الا امید

ہم سب خدامانِ حضرتِ والا کے لئے یہ بڑی سعادت کا موقع ہے کہ اللہ رب العزت کے فضل وکرم اور بزرگوں کی دعا وتوجہات کے طفیل مرشد العلماء حضرت اقدس مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے مواعظ کی پہلی جلد حضرت اقدس دامت برکاتہم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرر ہے ہیں۔

اور حضرت اقدس کی وساطت سے حضرت کے تمام متوسلین، مسترشدین، محبین ومخلصین کی خدمت میں بھی پیش کر رہے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ اس مجموعۂ مواعظ سے بھی ایسا ہی استفادہ کیا جائے گا جیسا کہ حضرتِ والا کے بالمشافہ مواعظ سے کیا جاتا ہے۔

ساتھ ہی درخواست ہے کہ مواعظ کی ضبط وترتیب میں اگر کہیں فروگذاشت نظر آئے تو اس سے مطلع کیا جائے، تاکہ اس کا تدارک ہو۔

از: مرتبین وناظم مکتبہ محمودیہ، محمود نگر ڈابھیل

پیش لفظ

باسمہ تعالیٰ

عصر حاضر میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوت وتبلیغ اور ہر خیر کی نشر و اشاعت کا بہترین پلیٹ فارم منبر ومحراب ہے، اور اس کی افادیت ایک امر یقینی ہے، لقوله تعالیٰ: وذكر فإن الذكرىٰ تنفع المؤمنين - تجربہ شاہد ہے کہ ہزارہا ہزار لوگ اس سلسلہ سے فیض یاب ہوئے۔

ادھر راقم کا حال یہ ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے مختلف تقریبات کے حوالے سے خلقِ خدا کی فرمائش، بلکہ اصرار شدید پر؛ وعظ وخطاب کا سلسلہ جاری ہے، کبھی جمعہ کے مجمع کی مناسبت سے، تو کہیں اصلاحی پروگرام کی تقریب سے، کبھی اختتام قرآن کی مبارک نسبت اور ختم بخاری کے مقدس موقع سے تو کبھی سالانہ جلسوں کی تقاریب میں۔ کبھی اندرون ملک تو کبھی بیرون ملک۔ اور پچھلے تین چار سالوں میں تو اس میں اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ تقریباً کوئی جمعہ اور کوئی تعطیل خالی نہیں۔

موقع ومحل کی مناسبت سے مختلف موضوعات زیر گفتگو آتے ہیں۔ عادت یہ ہے کہ پہلے سے ہی کوئی سا ایک موضوع منتخب کر کے متعلقہ قرآنی ونبوی مضامین اور سیرتِ صحابہ وصالحین سادہ اور عام فہم انداز میں سامعین کے گوش گذار کرتا ہوں۔

گذشتہ کئی سالوں سے احباب کا پیہم اصرار ہے کہ ان خطابات کو منظر عام

پر لایا جائے۔خطبات بروقت ضبط تو کر لئے جاتے ہیں،لیکن ان کو نقل کرنا سب سے اہم مسئلہ ہوتا ہے۔چنانچہ مختلف احباب نے مختلف اوقات میں اس میں دل چسپی لے کرایک اہم مرحلہ پورا کیا۔بالآخر ترتیب وتبویب کا مرحلہ آیا۔اسے عزیزم مفتی فرید کاوی سلمہ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔جس کے نتیجہ میں جلداول ہمارے ہاتھوں میں ہے۔اللہ تعالیٰ ان سب ہی احباب کو دارین میں اپنے شایانِ شان جزائے خیر دے۔سب کے علم وعمل میں برکت دے۔آمین۔

مرشدی ومولائی فقیہ الامت حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کی جانب انتساب کرتے ہوئے اس مجموعہ کا نام ''محمودالمواعظ'' رکھا ہے۔

جو کریم ذات ہر محفل ومجلس میں میری رہ نما رہی،اسی سے دعا ہے کہ اس مجموعہ کو خیر کے پھیلنے اور شر کے خاتمہ کا ذریعہ بنائے،اور اسے قبول عام نصیب فرمائے۔آمین

املاہ العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۲/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ،مطابق:۷/۱۰/۲۰۱۵

اجمالی فہرست

اہل علم کے لیے قیام اللیل اور ذکر اللہ کی اہمیت

ہم لوگ اپنے اسلاف کا تذکرہ بڑی گرویدگی، محبت اور عشق سے کرتے ہیں اور علمی سلسلے میں بھی ہمارے اسلاف کے انداز کو بیان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے اکابر واسلاف نے دین اور علم دین کی اشاعت، حفاظت اور خدمت کا جو مشن جاری کیا ہے، ہم اسی کو لے کر چل رہے ہیں اور دین وعلمِ دین کی اشاعت اور حفاظت کی نسبت سے - بحمد اللہ، اللہ تعالی توفیق دیتے ہیں اس کے مطابق - اپنے مقدور بھر، جیسا تیسا ہی سہی، بہت کچھ کر لیتے ہیں؛ لیکن ضرورت یہ جاننے کی ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر میں اس سلسلے کو شروع کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کون سے اوصاف وکمالات تھے جن کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالی نے ان کے جاری کیے ہوئے اس سلسلے میں خیر و برکت مقدر فرمائی؟

عنوانات		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا، و نعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له، و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و نشهد أن سيدنا و مولانا محمدا عبده و رسوله۔ أرسله إلى كافة الناس بشيرا و نذيرا و داعيا إلى الله بإذنه و سراجا منيرا۔

صلى الله تعالى عليه و على آله و أصحابه و بارک و سلم تسليما كثيرا كثيرا۔

أما بعد

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلاَّ قَلِيْلاً نِصْفَهٗ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلاً أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلاً، إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْکَ قَوْلاً ثَقِيْلاً، إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَ أَقْوَمُ قِيْلاً، إِنَّ لَکَ فِيْ النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلاً وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلاً۔ (مزمل ۸-۱)

و قال تعالى:

وَ مِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَکَ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوداً۔ (الإسراء: ۷۹)

وقال تعالی: كَانُوْا قَلِيْلاً مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (الذاريات: ۱۸-۱۷)

وقال تعالی: وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً (فرقان: ۶۴)

وقال تعالی: وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ أَنَابَ إِلَّى (لقمان: ۱۵)

وعن سلمان الفارسی رضی اللہ تعالی عنه قال: قال النبی ﷺ: عليكم بقيام الليل، فإنه دأب الصالحين قبلكم و مقربة لكم إلى ربكم و مغفرة للسيئات و منهاة عن الإثم و مطردة للداء عن الجسد، أو كما قال عليه الصلوة والسلام۔ (معجم كبير طبرانی، ۶۱۵۴)

حضرات علماء کرام، مشائخ عظام اور عزیز طلبہ!

اللہ تبارک وتعالی نے آپ حضرات کو اپنے دین کے علم کی نعمت سے نوازا ہے۔ اور آپ کے قلوب کو علم دین کا مخزن بنایا ہے۔ یہ اللہ تعالی کا بڑا انعام ہے۔

علم اور اہل علم کا مقام

صاحب درمختار نے اپنے مقدمے میں واقعہ نقل کیا ہے کہ امام محمد بن حسن شیبانیؒ کو انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالی نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ تو اس کے جواب میں امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالی نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا، اے محمد! اگر تمہیں عذاب دینا مقصود ہوتا تو اپنے دین کا علم تمہارے سینے میں نہ رکھتا۔

یہ علمِ دین اللہ تبارک وتعالی کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تبارک وتعالی کی

طرف سے اس کی عنایت علامت ہے کہ جس کو یہ نعمت دی گئی ہے، اس پر اللہ تبارک وتعالی کی خاص عنایت ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **من يريد الله به خيرا يفقهه في الدين:** اللہ تبارک وتعالی جس کے ساتھ خیر عظیم کا ارادہ فرماتے ہیں- خیراً کی تنوین تعظیم کے لیے ہے- اس کو اپنے دین کی سمجھ، فہم اور علم عطا فرماتے ہیں۔ گویا اللہ تعالی کی طرف سے علم دین کی نوازش کوئی معمولی نعمت نہیں۔

فضائل قرآن میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ نے حضرت سعید بن سلیم کی حدیث مرسل نقل فرمائی ہے کہ، جو شخص قرآن شریف کو حاصل کر لے اور پھر کسی دوسرے شخص کو جسے کوئی اور چیز عطا کی گئی ہو، اپنے سے افضل سمجھے تو اس نے حق تعالی شانہ کے اس انعام کی جو اپنے کلام پاک کی وجہ سے اس پر فرمایا ہے، تحقیر کی ہے۔ (فضائل قرآن: ۵۰۲)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے آپ حضرات کو جس عظیم نعمت سے سرفراز فرمایا ہے، وہ ایسی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی اور نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اور اسی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو اونچا مقام بھی عطا فرمایا ہے۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں: **قل هل يستوی الذين يعلمون والذين لا يعلمون** جو جاننے والے ہیں، علم کی دولت سے سرفراز کیے گئے ہیں وہ اور جو نہیں جانتے؛ بھلا یہ دونوں برابر و یکساں ہو سکتے ہیں؟ مساوات کی نفی یا تو مرتبہ کے اعتبار سے ہے یا ذمہ داریوں کے اعتبار سے۔ ظاہر ہے کہ جن کو اللہ تعالی نے علم عطا فرمایا ہے ان کی ذمہ داریاں ان لوگوں کے مقابلہ میں جو علم سے محروم ہیں، بہت بڑھ کر ہیں۔

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی مشکل سوا۔

اللہ تعالی جس کو اونچا مقام عطا فرماتا ہے، اس اعتبار سے اس پر ذمہ داریاں بھی ڈالتے ہیں۔ دنیا کا بھی یہ دستور ہے جس کو کوئی اونچا منصب دیا جاتا ہے، اس کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہی ہوتی ہیں۔

منصب کیا ہے؟ منصب درحقیقت چند ذمہ داریوں کے مجموعے کا نام ہے، وہ ذمہ داریاں جتنی عظیم ہوتی ہیں اتنا ہی وہ منصب بھی اونچا اور عظیم سمجھا جاتا ہے۔

کسی ملک کی وزارت عظمی ایک منصب اور عہدہ ہے، جس شخص کو کسی ملک کا وزیر اعظم بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے اس کو چند بڑی بڑی ذمہ داریاں، ایسی دی گئیں جو کسی اور کے حوالے نہیں کی گئیں، اسے ان ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے، اور اسی کی وجہ سے اس کو وزیر اعظم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ کوئی لڈّو نہیں ہے کہ آسانی سے آدمی کھا کر ہضم کر لے؛ بلکہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ جو لوگ امانت دار ہوتے ہیں، اور صفتِ امانت کی وجہ سے ان کو ذمہ داریاں حوالے کی جاتی ہیں، وہ ان ذمہ داریوں کو اور اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، ان پر جب کوئی ذمہ داری ڈالی جاتی ہے تو اولاً تو وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں؛ لیکن بڑوں کی طرف سے جب جبراً اس کے لیے مامور و مجبور کیا جاتا ہے اور قبول کروایا جاتا ہے، تو پوری زندگی ان کی خوف میں گذرتی ہے، کہ پتہ نہیں ان ذمہ داریوں کے حقوق ادا کر پاؤں گا یا نہیں؟ اور اس معاملہ میں ہر وقت ڈرے سہمے رہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا دورِ خلافت اسلامی تاریخ میں زریں اور قابل نمونہ دور سمجھا جاتا ہے۔غیر مسلم بھی حکومت اور سلطنت چلانے کے اعتبار سے ان کے دور کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ان کے خوف کا حال کتابوں میں لکھا ہے،فرماتے تھے کہ دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا اگر پیاسا مر جائے گا تو میں ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کو مجھ سے اس کا سوال نہ ہو۔

اور اخیری حج کیا تو اس موقع پر انہوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ یا اللہ سلطنت کا رقبہ بہت پھیل چکا ہے، میں کسی کا حق ادا کرنے کے معاملہ میں کوتاہی کا شکار بنوں اس سے پہلے مجھے اٹھا لے۔

شکر کس طرح ادا ہو؟

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس نعمت سے ہمیں اور آپ کو نوازا ہے وہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے؛ لیکن جیسا کہ پہلے بھی آپ کو کبھی بتایا گیا ہوگا،ایک شکر زبانی ہوتا ہے اور ایک حقیقی ہوتا ہے۔

زبانی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی زبان سے یوں کہے کہ اللہ تیرا احسان ہے، تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں یہ نعمت عطا فرمائی ہے اور حقیقی شکر یہ ہے کہ اس نعمت کی نسبت سے اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض منصبی عائد ہو رہے ہیں ان ذمہ داریوں اور فرائض منصبی کو کما حقہ ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ یہ حقیقی شکر ہے۔یہی نعمت کی قدر دانی ہے۔آدمی جب یہ کر لیتا ہے تو اللہ کی رضا اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔کیسے پیارے انداز میں قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں، **مَایَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ إِنْ**

شَكَرْتُمْ وَ آمَنْتُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا۔

اللہ میاں تم کو عذاب دے کر کیا کریں گے، اِن شکر تم اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرلو اور اس کا حق بجالاؤ۔ و آمنتم اور ایمان کے تقاضوں کو تم پورا کرو۔

اللہ کے شاکر ہونے کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تو بڑے قدردان ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف شکر کی نسبت کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اللہ کی نعمت کا حق ادا کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے اسی کی مناسبت سے اس کو مزید نوازا جاتا ہے۔

اہلِ علم کے ساتھ مذاکرہ

بہرحال اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے علم دین کی، وہ بہت عظیم نعمت ہے، اور اس نعمت کی نسبت سے بہت سی ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ اہل علم سے جب گفتگو کرنے کی نوبت آتی ہے تو دل یہ کہتا ہے کہ یہ باتیں کس کے سامنے کہی جارہی ہیں؟ یہ تو وہ طبقہ ہے جو ان چیزوں سے اچھی طرح واقف ہے، ہوسکتا ہے، بلکہ یقیناً ایسا ہے کہ بہت سی وہ چیزیں جو میں بھی نہیں جانتا آپ کے علم میں ہوں گی۔

بس مقصد یہ ہے کہ مذاکرہ ہوجائے، ہم آپس میں مل بیٹھ کر کے اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں گفتگو کرلیں اور اپنی ذمہ داریوں کو یاد کر کے تازہ کر کے احساس پیدا کر کے آئندہ ایک نیا عزم اور نیا ارادہ لے کر اٹھیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان ذمہ داریوں کی ادا یگی کا اہتمام اور توفیق نصیب فرمائے۔

کبھی جاننے والے کو بھی اس طرح سبق یاددلانے کے لیے، جیسے کہ کوئی دوسرا

شخص بیٹے کو کبھی کہتا ہے کہ یہ تیرا باپ ہے۔ساری دنیا جب جانتی ہے کہ یہ اس کا باپ ہے تو بیٹا کیوں نہ جانتا ہوگا کہ وہ اس کا باپ ہے۔حقیقت یہ کہ بیٹا بھی جانتا ہے؛ مگر باپ کی نسبت سے جو حقوق بیٹے پر ہیں، اس کی ادا یگی میں جو کوتاہی وہ محسوس کررہے ہیں اس کی طرف اس کو متوجہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔وہاں یہی ایک جملہ کافی ہوجاتا ہے اور کسی نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میں اگر آپ کے سامنے اتنا ہی کہہ دوں کہ اللہ تعالی نے ہمیں علم کی بڑی نعمت سے نوازا ہے تو ہمیں احساس دلانے کے واسطے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے۔

اہلِ علم سے لوگوں کو شکایت

ویسے تو ہماری ذمہ داریوں کی نسبت سے بہت کچھ باتیں کہی جاسکتی ہیں، اورآج کل تو اس سلسلے میں ہمارا کہنے کا میدان وسیع ہوتا جارہا ہے۔مگر آج کی مجلس کے لیے میں نے ایک خاص موضوع سوچا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ لوگوں کو ہم سے بہت ساری شکایتیں ہیں۔ میں اپنے کو بھی بری نہیں کرتا، ہمارے پورے طبقہ کے متعلق شکایت ہے- آپ کی طرف سے وکالۃً یہ بات عرض کرتا ہوں کہ ہم سے متعلق لوگوں کو بہت شکایتیں ہیں- خاص طور پر فریاد ہے کہ ذمہ داریوں کی ادا یگی میں اوراپنے فرائض منصبی کو سمجھنے، احساس رکھنے اوراس کو ادا کرنے کے معاملہ میں ہم سے کوتاہی ہورہی ہے۔اس شکایت کے تدارک کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں ہر ہر چیز یاد دلائی جائے؟ میرے دل میں ایک بات آئی، کہ ایک ایسی چیز کی طرف آپ حضرات کو متوجہ کروں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک،

ہمارے اکابر کے آخری دَور تک -اکابر دیوبند کے دَور تک- تمام اسلاف کا طرہ امتیاز رہا اور اس کی طرف سے ہم اور آپ غفلت برت رہے ہیں۔

ہم لوگ اپنے اسلاف کا تذکرہ بڑی گرویدگی، محبت اور عشق سے کرتے ہیں اور علمی سلسلے میں بھی ہمارے اسلاف کے انداز کو بیان کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے اکابر واسلاف نے دین اور علم دین کی اشاعت، حفاظت اور خدمت کا جو مشن جاری کیا ہے، ہم اسی کو لے کر چل رہے ہیں اور دین وعلمِ دین کی اشاعت اور حفاظت کی نسبت سے- بحمد اللہ، اللہ تعالیٰ توفیق دیتے ہیں اس کے مطابق- اپنے مقدور بھر، جیسا تیسا ہی سہی، بہت کچھ کر لیتے ہیں؛ لیکن ضرورت یہ جاننے کی ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر میں اس سلسلے کو شروع کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کون سے اوصاف وکمالات تھے جن کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے جاری کیے ہوئے اس سلسلے میں خیر وبرکت مقدر فرمائی۔ عملی اعتبار سے ہمارے اسلاف میں جو مختلف صفات، خوبیاں اور کمالات تھے، ان میں سے دو چیزیں ایسی ہیں، جو اِس وقت ہمارے علماء کے طبقے میں کم ہوتی جارہی ہیں۔

اکابر کے دو وصف اور ہماری اس میں غفلت

ایک ہے: قیام اللیل، اور دوسری ہے: ذکر اللہ۔

ان دونوں چیزوں کی طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ دو کمالات اور خوبیاں ہیں، جن کے نتیجہ میں آدمی جو دینی کام اور خدمات انجام دیتا ہے، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ جان ڈالتے ہیں، اس لیے ہمیں اپنے اسلاف کی

ان دونوں صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے جو بھی مجاہدہ، جو بھی مشقت، جو بھی ریاضت مطلوب ہو، اس کو انجام دینے میں کوئی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے اسلاف کی زندگیوں کا اوران کی سوانح کا مطالعہ کیجیے، اس میں یہ دو چیزیں آپ کو خصوصیت کے ساتھ ملے گی۔

یہ اوصاف اور کمالات اس سلسلے کو کامیابی سے لے کر چلنے کے لیے بہت ضروری ہیں، اور جب تک ہم اپنے اندر یہ اوصاف پیدا نہیں کریں گے؛ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔ ایک ڈھانچہ ہمارے ہاتھ میں آئے گا؛ لیکن وہ دھانچہ روح اور حقیقت سے خالی ہوگا، لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اس کے لیے سنجیدگی سے سوچیں اوراس کے متعلق بار بار اپنا جائزہ لے کر اپنے اندر ان اوصاف و کمالات، اور دیگر جن چیزوں کی کمی ہو، ان کو حاصل کرنے کے لیے مسلسل کوشش اور سعی میں لگے رہیں۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ یہ سارے اوصاف علی وجہ الکمال ہم حاصل کرلیں، لیکن ان اوصاف کے سلسلے میں اپنے محاسبہ کے بعد جن کمیوں کو ہم محسوس کریں، ہمیں ان کا احساس اور ادراک ہونا چاہیے، اوراس کی تلافی کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

تہجد کی فرضیت اور قیام اللیل کی مقدار

ویسے تو یہ کوئی اُن ہی کی خصوصیت نہ تھی، نبی کریم ﷺ نے بھی امت کو اس کی طرف متوجہ فرمایا ہے اور اللہ تبارک وتعالی نے قرآن پاک میں اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جو حضرات شروع میں ایمان لائے، ان

پر جب کہ ابھی پنج وقتہ نمازیں فرض نہیں کی گئی تھیں، اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے سب سے پہلی جو نماز فرض کی گئی وہ 'قیام اللیل' ہے۔ سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتوں میں اللہ تبارک و تعالی نے اسی کا حکم دیا ہے: **یا أیھا المزمل ، قم اللیل ، إلا قلیلا**۔ اے چادر اوڑھنے والے، رات کو اللہ کے سامنے عبادت کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

اللیل: یعنی پوری رات۔ **إلا قلیلا**: یعنی اس پوری رات میں سے کچھ حصہ مستثنی کر دیا گیا کہ کچھ حصے کو چھوڑ کر باقی رات میں آپ کو قیام اللیل کا اہتمام کرنا ہے۔

اور وہ کچھ حصہ جس کا استثناء کیا گیا ہے وہ کیا ہے؟ **نصفه أو انقص منه قلیلاً أو زد علیه**، یعنی پوری رات میں جو حصہ مستثنی ہے، جس میں آپ آرام کریں گے، وہ آدھی رات ہے۔ آدھی رات جب مستثنی ہوئی تو آدھی رات کے قیام کا حکم ہوا۔

پھر فرمایا: **أو انقص منه** ، یا یہ مستثنی حصہ جس میں قیام نہیں ہے، آدھی رات سے کچھ کم یعنی ایک تہائی کم کرو۔ مستثنی ایک تہائی ہو تو قیام دو تہائی کا کرنا ہوگا۔

اس کے بعد ارشاد ہوا: **أو زد علیه**، یا آدھے سے کچھ زیادہ کا استثناء۔ اس صورت میں دو تہائی کا استثناء ہوا یعنی ایک تہائی رات کا قیام کرنا ہوگا۔

یہ تین شکلیں ہیں۔ (۱) آدھی رات عبادت کریں۔ (۲) دو تہائی عبادت کریں (۳) یا ایک تہائی۔

یہ بات شروع سورۃ میں تو اس انداز میں بیان کی گئی ہے، پھر آگے جہاں اللہ تبارک وتعالی نے اس فرضیت کو اٹھائے جانے کا بیان فرمایا ہے تو وہاں ان شکلوں کو

اور صراحت اور وضاحت کے انداز میں بیان کیا ہے:

إن ربک یعلم أنک تقوم أدنی من ثلثی اللیل و نصفه و ثلثه و طائفة من الذین معک: تیرا رب بخوبی جانتا ہے، کہ آپ دو تہائی رات کے قریب اللہ کے حضور عبادت میں کھڑے رہتے ہیں، یا آدھی رات یا ایک تہائی رات۔

گو یا نبی کریم ﷺ اور اس وقت جو حضراتِ صحابہ ایمان لا چکے تھے، ان کی جماعت کے اہتمامِ تہجد اور قیام اللیل کی تین شکلیں یہاں بتائیں۔شروع سورت میں جس حکم کا ذکر ہے، اُس کی اس آخری آیت سے وضاحت ہو جاتی ہے، بہر حال یہ تین طریقے قیام اللیل کے بتائے گئے۔

چنانچہ ایک مدت تک یہ قیام اللیل فرض رہا۔ اس کے بعد اس کی فرضیت منسوخ کی گئی، کب منسوخ ہوئی ؟ اس سلسلے میں روایتیں مختلف ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت یہ ہے کہ ایک سال تک یہ حکم رہا اور پھر ایک سال کے بعد اسی سورت کی آخری آیات: **إن ربک یعلم أنک تقوم أدنی من ثلثی اللیل و نصفه و ثلثه و طائفة من الذین معک و الله یقدر اللیل و النهار، علم أن لن تحصوه فتاب علیکم فاقرء وا ما تیسر من القرآن**، نے آکر اس فرضیت کو علی الاطلاق منسوخ کر دیا۔یعنی کہ بہ قول حضرت عائشہؓ: ایک سال تک یہ حکم رہا۔

لیکن حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مکمل تہجد منسوخ نہیں ہوئی۔ دو تہائی، آدھی رات اور ایک تہائی رات کی جو مقدار تھی اس کو تو منسوخ کیا؛ البتہ تھوڑی مقدار پوری رات میں اللہ کے حضور کھڑے رہنے کی فرضیت باقی رکھی گئی۔ اس لیے کہ آگے باری تعالی نے فرمایا ہے کہ: **علم أن لن تحصوه فتاب علیکم**

فاقرئوا ما تیسر من القرآن، اس میں جو **فاقرئوا ما تیسر من القرآن**، ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنا تم سے ہو سکے اتنا تو کرنا ہی ہے۔

پھر یہ تھوڑے حصہ کے قیام کی فرضیت بھی، جب پانچ وقت کی نمازیں معراج کے موقعہ پر فرض ہوئیں تو اس وقت منسوخ ہوگئی۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا مسلک اور قول ہے۔

بہر حال میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالی نے قیام اللیل کو ابتداءِ اسلام میں نبی کریم ﷺ اور جو حضرات صحابہؓ اس وقت ایمان لا چکے تھے، ان پر فرض قرار دیا تھا۔

حضور ﷺ کے حق میں تہجد کی فرضیت کی تفصیل

پھر یہ فرضیت حضور ﷺ کے حق میں اب بھی باقی ہے یا نہیں، یہ مسئلہ بھی علماء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔اس کی وجہ سورہ اسراء میں نبی کریم ﷺ کے لیے باری تعالی کا یہ ارشاد ہے: **ومن اللیل فتہجد بہ نافلۃ لک**۔رات کے کچھ حصے میں قرآن پاک کو لے کر کھڑے رہو اور اپنی نیند کو چھوڑو۔

تہجد، کا لفظ ہجود سے بنا ہے، ہجود کا لفظ نیند کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بیداری کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔عربی میں بعض کلمات ایسے ہوتے ہیں جو متضاد کہلاتے ہیں، یعنی اس میں دو ایسے معنی، جو ایک دوسرے کی ضد ہوں، پائے جاتے ہیں، اس طرح ہجود نیند کو بھی کہتے ہیں اور بیداری کو بھی کہتے ہیں۔

یہاں **فتہجد بہ** ، میں 'بہ' کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، باری تعالی

فرماتے ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے زریعہ سے بیدار رہو، یعنی نماز میں قرآن پڑھو۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم لوگ **فتهجد به** پر عمل کرتے ہیں؛ مگر دوسرے معنی میں، بیداری والے نہیں، بلکہ نیند والے معنی پر۔ گویا ہم نے بھی اس پر عمل کی دوسری شکل ایجاد کر لی ہے۔ یہ میرا اپنا نکتہ ہے۔

یہاں '**نافلة لک**' کا کیا مطلب؟ جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے قیام اللیل کی فرضیت ساقط نہیں ہوئی، باقی ہے؛ وہ **نافلة لک** کو موصوف محذوف کی صفت قرار دیتے ہیں، یعنی: **فریضة نافلة لک**، یہ ایسا فریضہ ہے جو زائد ہے آپ کے لیے، دوسری امت کے لیے نہیں۔ لیکن جمہور اس طرف گئے ہیں کہ تہجد اور قیام اللیل کی فرضیت سب سے ساقط ہوگئی ہے، اس طرح **نافلة لک** کو کسی موصوف محذوف کی صفت قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ مطلقاً یہ ایک زائد نماز ہے جو آپ ادا کریں گے۔

تہجد کے آداب، فوائد اور مقاصد

اور پھر آگے اسی صورت میں اس کے آداب کیا ہیں؟ فرضیت کی کیا وجوہات ہیں؟ کیا فوائد ہیں؟ یہ سب بھی بتلایا گیا ہے۔

قم اللیل إلا قلیلا، نصفه أو انقص منه قلیلا، أو زد علیه و رتل القرآن ترتیلا۔

یعنی قیام اللیل کے اندر قرآن کو ترتیل سے، ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا بھی اہتمام

ہونا چاہیے۔ حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ صلوۃ اللیل میں اصل مقصد یہی ہے کہ قیام میں آدمی قرآن پاک کی تلاوت کرے، جتنا زیادہ اس کا اہتمام کرسکتا ہے کرے۔ اس ترتیل میں یہ بھی ہے کہ کچھ معمولی جہر بھی ہو، آواز میں درد ہو، اور ساری دوسری چیزوں کی رعایت بھی ہو۔

آگے اللہ تبارک وتعالی قیام اللیل کی فرضیت کی بنیادیں بتلاتے ہیں:

إنا سنلقی علیک قولا ثقیلاً، اے نبی ہم آپ پر ایک بھاری کلام اتار نے والے ہیں، یعنی قرآن پاک جس کا ابھی نزول شروع ہوا تھا،۔ سورہ مزمل ابتدائی سورتوں میں سے ہیں۔ گویا اللہ تبارک وتعالی یہ فرماتے ہیں کہ وہ بھاری کلام جو آپ پر اتارا جانے والا ہے، اس کو اٹھانے اور برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالی نے یہ حکم دیا ہے۔

قولا ثقیلا یعنی قرآن کا بھاری ہونا حسی اعتبار سے بھی تھا اور معنوی اعتبار سے بھی تھا۔ حسی اعتبار سے یوں ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ کے چہرہ انور کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا، آپ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح سخت سردی میں بھی لڑھکا کرتے تھے، اور کھڑاتوں جیسی آواز ظاہر ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑی مشقت محسوس کرتے تھے اور روایتوں میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر اپنی اونٹنی قصوا پر سوار ہوتے اور وحی نازل ہوتی تو وحی کے بوجھ سے، اونٹنی بیٹھ کر کے اپنا چہرہ زمین پر رکھ دیا کرتی تھی، حالانہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نازل ہوتی تھی، اونٹنی پر نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس پر سوار ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آنے والے اس بوجھ کے اثر سے اونٹنی بیٹھ کر کے اپنا چہرہ زمین پر رکھ دیا کرتی تھی۔

إن ناشئة الليل هی أشد وطأ و أقوم قيلا۔

وطأ یطأ کا ایک معنی روندنا ہے۔ گویا نفس کو روندنے میں اور نفس کشی میں یہ عمل یعنی قیام اللیل جتنا مؤثر ہے کوئی دوسرا عمل اتنا مؤثر نہیں ہے۔

وطأ، مواطات سے بھی ہے، مطلب یہ ہوگا کہ رات کے وقت اللہ کی عبادت کریں گے تو اس کی وجہ سے آدمی کے اعضاء میں ایک دوسرے سے یکسانیت رہے گی، زبان، کان، دل؛ سب موافق ہوں گے۔ زبان قرآں کی تلاوت کر رہی ہے، کان پورے شوق و رغبت کے ساتھ سننے میں مشغول ہے اور دل اس سے لطف حاصل کر رہا ہے۔

و أقوم قيلا: یعنی اسکی برکت سے بات بھی درست اور سیدھی نکلا کرتی ہے۔

آگے باری تعالی فرماتے ہیں، إن لک فی النهار سبحا طويلا

اے نبی آپ کے لیے دن میں بڑی مشغولیت ہے۔

سوچئے! نبی کریم ﷺ کی دن کی مشغولیت کیا تھی؟

کیا آپ کی کوئی کھیتی باڑی تھی؟

کیا آپ کی کوئی فیکٹری یا کارخانہ تھا؟

کیا آپ کی کوئی تجارت تھی؟

کوئی چیز نہیں۔

علمی و دعوتی مشاغل کافی نہیں

دن میں آپ ﷺ لوگوں کو ایمان و اسلام کی دعوت دیتے تھے، قرآن

سکھاتے تھے اور احکام اسلام سے لوگوں کو واقف کرتے تھے، پورا دن آپ کا ان ہی مشاغل میں گذرتا تھا، اس کے باوجود باری تعالی یہ فرماتے ہیں کہ اے نبی! آپ کو دن میں مشغولی ہے، گویا ان کاموں کی مشغولی کی وجہ سے آپ لوگوں کے اندر رچے بسے رہتے ہیں، ان کاموں کو انجام دینے کیلئے لوگوں کے ساتھ اختلاط درپیش رہتا ہے۔ آپ کو تنہائی کا اور اپنے رب کے حضور خلوت کا موقع ملتا نہیں ہے، اس لیے دن میں تو یہ کام کیجیے، اور رات کو آپ اللہ کی عبادت میں مشغول رہئے اور 'واذكر اسم ربک و تبتل إليه تبنتيلا' رات کو اللہ کو یاد کرو اور ساری دنیا سے کٹ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اس موقع پر میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں:

ہمارے اہلِ علم کا طبقہ اور دوسرے جو لوگ بھی دینی خدمات مختلف شکلوں میں انجام دیتے ہیں؛ چاہے وہ تعلیم کی شکل میں ہو، تدریس کی شکل میں ہو، تالیف و تصنیف کی شکل میں ہو، دعوت و تبلیغ کی شکل میں ہو؛ عام طور پر وہ حضرات کہتے ہیں کہ: یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ کیا ہے؟ ہم جن کاموں کو انجام دے رہے ہیں وہ کوئی دنیاداری تو ہے نہیں، وہ بھی تو دین کے کام ہیں، لہٰذا رات کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے، جس نے ہم کو رات کے قیام سے محروم کر رکھا ہے۔

اہلِ علم، مبلغین اور مصلحین کے لیے شبینہ معمولات

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن (۸-۵۹۳) میں

اسی آیت کے ذیل میں فائدے کے عنوان سے لکھا ہے کہ وہ تمام علماء اور مشائخ جو لوگوں میں تعلیم و تربیت اور اصلاح کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کے لیے اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ فقط دن کے وقت درس و تدریس، تعلیم، اصلاح کا مشغلہ ہونا چاہیے اور رات کو اللہ کی عبادت کے لیے فارغ کریں۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے لے کر اسلاف کے اندر یہی طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ لوگ دن میں ان کاموں کو انجام دیتے تھے۔ -یعنی دینی فرائض، دنیوی امور نہیں- اور رات کو اللہ تعالی کی عبادت کے لیے فارغ کرتے تھے۔ اِلا یہ کہ تعلیمی یا اصلاحی لائن سے کوئی وقتی ضرورت پیش آتی تو اس ضرورت کے بقدر وہ رات کا وقت اس میں استعمال کرتے تھے، ورنہ اپنی راتیں اللہ کی عبادت کے لیے اور اللہ تعالی طرف رجوع اور انابت کے لیے استعمال کرتے تھے۔

مقام نبوت اور مقام ہدایت

یاد رکھیے، ایک نبی کی نبوت کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اس کا وہ پہلو جس میں وہ اللہ تعالی سے اپنا تعلق استوار کرتا ہے۔

دوسرا پہلو وہ ہے جس میں وہ اللہ کے احکام کو اس کے بندوں تک پہنچانے کا اپنا سلسلہ اور فریضہ مخلوق کے ساتھ مل جل کر انجام دیتا ہے۔

یہ دو مقام ہیں: مقام نبوت اور مقام ہدایت۔

آپ نے پڑھا ہوگا، آپ تو مستقل بحثیں کرتے ہیں، ولی ولی ہے، نبی نہیں ہے، لیکن نبی ولی بھی ہے اور نبی بھی۔

ولایت والے مقام میں اس کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے، اور نبوت والے مقام میں مخلوق کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان میں کونسا مقام اونچا ہے، علماء محققین نے اس سلسلے میں مستقل بحثیں کی ہیں کہ بہ حیثیت مقام کے کون سے مقام کو ترجیح دی جائے۔

بہر حال، نبوت، نبأ سے ماخوذ ہے، نبأ کا معنی ہی خبر دینا ہے، چوں کہ وحی کے ذریعہ جو احکام نبی تک پہنچ رہے ہیں ان احکام کو نبی ہی اللہ کے بندوں تک پہنچاتا ہے اور ان کو اس کی خبر دیتا ہے اس لیے اس کو نبی کہتے ہیں، یعنی نبوت کا سارا کام مخلوق سے متعلق ہے اور اس میں مخلوق کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے۔

هم بالليل رهبان وبالنهار فرسان

حضرات صحابہؓ دین کی دعوت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو لے کر جب دنیا میں پھیلے اور اللہ تعالی نے انہیں کامیابی عطا فرمائی، تو دشمنوں نے سوچا کہ ان حضرات میں وہ کون سی چیز ہے، جو ان کو آگے بڑھا رہی ہے اور دشمن اس کا جواب نہیں دے سکتا، اس کی اندرونی 'لم' معلوم کرنے کے لیے اپنے جاسوس بھی جگہ جگہ بھیجے، اور ہم تعلیم میں پڑھتے ہیں کہ ان کے جاسوس حضراتِ صحابہ کے ساتھ رہتے تھے، دن اور رات میں، ہر جگہ اور ہر وقت، اور پھر ان کے سارے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو رپورٹ اپنے بڑوں کو سامنے پیش کرتے تھے، اس کا خلاصہ یہ ہوتا تھا کہ ''**هم بالليل رهبان و بالنهار فرسان**'' یہ وہ جماعت ہے جو رات کے وقت اللہ کے سامنے عبادت میں مشغول رہتی ہے اور دن کے وقت اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر دشمن کے مقابلہ میں میدان جنگ میں ہوتی ہے۔ یہ 'باللیل

رھبان‘ وہ چیز تھی جس نے حضرات صحابہ اورامت کے ان تمام افراد کو جنہوں نے کامیابی کے ساتھ دین کی خدمت کا فریضہ انجام دیا؛ آگے بڑھنے کا موقع دیا ہے۔اسی لیے قیام اللیل کی بڑی اہمیت ہے۔

میدان جنگ میں جوآدمی کام کرتا ہو، وہ کتنا تھک جاتا ہوگا؟ لیکن اس کے باوجودوہ تھکاوٹ اور وہ تعب ان کو اللہ کے سامنے رات کے وقت کھڑے ہونے سے رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ یہی وہ نسخہ ہے اور یہی وہ گُر ہے، جس کے ذریعہ ان حضرات نے دنیا کو زیر کیا اور دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں اللہ تعالی نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔

ان معانی اور مضامین کی وجہ سے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پوری سورہ مزمل کی تفسیر کا بار بار مطالعہ کیا جائے۔

قرآن میں قیام اللیل کی تاکید

قیام اللیل کے سلسلے میں اللہ تعالی نے قرآن میں اور مقامات پر بھی حکم دیا ہے۔سورۂ ذاریات میں ہے:

کانوا قلیلا من اللیل ما یھجعون وبالاسحار ھم یستغفرون۔ (الذاریات: ۱۸-۱۷)

رات کا بہت کم حصہ وہ سوتے ہیں، اور سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں۔

گویا اللہ نے ان کی یہ خوبی بیان کی کہ ان کی رات کا بڑا حصہ اللہ کی عبادت میں، اس کی یاد میں اور اس کے ذکر میں گذرتا ہے اور پھر جب رات کا آخری حصہ

آتا ہے تو ان کو اپنی کمی کا حساس ہوتا ہے اور وہ اللہ کے سامنے استغفار کرتے ہیں۔
بہر حال قرآن میں بہت ساری آیتیں ہیں جس سے آپ قیام اللیل کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مقامِ شفاعت اور قیام اللیل کا تعلق

سورہ اسراء میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: **فتهجد به نافلة لك**۔ کہ اے نبی! آپ قرآن پاک کے ذریعہ اپنی نیند کو چھوڑ کر بیداری اختیار کیجیے۔ یعنی اللہ کے سامنے قیام اللیل اختیار فرما کر اپنی نیند چھوڑ یے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ **فتهجد به** پر آگے **عسى أن يبعثك ربك مقاما محمودا** مرتب کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مقام شفاعت کے حصول میں 'قیام اللیل' کا بڑا دخل ہے۔ اہل علم کو بھی اللہ تعالی شفاعت کا مقام عطا فرمائیں گے، اور انہیں بھی یہ اسی صورت حاصل ہوگا جب تہجد کا اہتمام ہو۔

عباد الرحمن۔

وعبادالرحمن الذين الخ میں اللہ تعالی نے اپنے مخصوص بندوں کی جو صفات بیان کیں، ان میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ **والذين يبيتون لربهم سجدا و قياما** جو اپنے رب کے سامنے رات گذارتے ہیں ایسی حالت میں کہ کبھی سجدے میں ہوتے ہیں اور کبھی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ کے اشعار ہیں:

وفينا رسول الله يتلو كتابه إذاانشق معروف من الصبح ساطع

أرانا الهدى بعد العمى فقلوبنا به موقنات إن ما قال واقع

يبيت يجافى جنبه عن فراشه إذا استثقلت بالكافرين المضاجع

(بخاری، کتاب الادب، باب ہجاء المشرکین، نمبر ۵۷۹۹)

جس وقت مشرکین کی خوابگاہیں ان پر بھاری ہوجاتی ہیں، آپ کا پہلو اپنے بستر سے راتوں کو جدا رہتا ہے اور اللہ کی عبادت میں اپنی رات گذارتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ إذا استثقلت بالمشر کین مضاجع یعنی بستر سے لگے رہنا، مشرکین کی عادت اور خصلت ہے۔ یہ اہل ایمان کی خصلت نہیں، اہل ایمان کی خصلت یہ ہے کہ وہ راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کا اہتمام فرمائیں۔

افلا أکون عبداً شکورا؟

نبی کریم ﷺ کا حال کیا تھا؟

بخاری شریف میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت عائشہؓ، دونوں کی روایتیں ہیں۔

کتاب التفسیر (سورہ فتح: ۴۵۵۶) میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم رات کو اتنا قیام کرتے تھے کہ حتی تورمت قدماہ آپ کے قدم مبارک ورم زدہ ہوجاتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ سے کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول قد غفر لک ما تقدم من ذنبک و ما تأخر، اللہ تعالی نے تو آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں، اس کے باوجود آپ اتنی مشقت کیوں اٹھا رہے ہیں؟ گویا سوال کرنے والے یوں سمجھے کہ اس طرح راتوں کی عبادت میں کھڑا ہونا

شاید گناہوں کو بخشوانے ہی کے لیے ہوگا، اور کسی مقصد کے لیے نہ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: أفلا أکون عبداً شکوراً۔ کیا میں اللہ تعالی کا شکر گذار بندہ نہ بنوں؟ اللہ نے اتنے سارے انعامات عطا فرمائے، اللہ کے ان انعامات کا تقاضا یہ ہے کہ میں راتوں کو اس کی شکر گذاری میں اللہ کے حضور کھڑا ہو کر اس سے مناجات کروں۔

نبی کریم ﷺ اس طرح ایک بہت بڑی غلط فہمی کو بھی دور کر رہے ہیں۔

کوئی آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ رات کو کھڑے ہو کر اتنی عبادت تو گنہ گار آدمی اپنے گناہوں کو بخشوانے کے لیے کرے گا اور جس کے پاس نیکیاں ہی نیکیاں ہوں وہ کاہے کو کھڑا ہو بھائی؟ حضور فرماتے ہیں: نہیں، اس کو بہ طریق اولی کھڑا ہونا چاہیے کیوں کہ اس پر اللہ تعالی نے اپنا فضل فرمایا اور یہ ساری روحانی نعمتیں عطا فرمائیں۔ حضور یہی فرمانا چاہتے ہیں کہ اللہ نے نبوت دی اور اتنا اونچا مقام عطا فرمایا، پس اس احسان کا شکر یہی ہے کہ میں راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑا رہوں۔

اہل علم کو اللہ نے علم کی نسبت سے جو مقامات عطا فرمائے ہیں اور جن نعمتوں سے نوازا ہے، دنیا کی کوئی اور نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس نعمت کی شکر گذاری اور اس نعمت کے حق کی ادائیگی یہی ہے کہ راتوں کو اللہ کے حضور کھڑا ہوا جائے۔

بخاری شریف کتاب التفسیر (سورہ فتح: ۴۵۵۷) ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ اتنا طویل قیام کرتے تھے کہ آپ کے قدم مبارک میں شگاف پڑ جاتا تھا اور پھٹ جاتے تھے۔

بخاری (کتاب التہجد: ۱۰۴۸) اور شمائل (باب ما جاء فی عبادۃ الرسول:

۲۶۵) میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ میں بھی کھڑا ہو گیا، آپ نے ایک رکعت میں سورہ بقرہ اور پھر سورہ آل عمران اور سورہ نساء پڑھیں، تو میں نے ایک بری چیز کا ارادہ کیا، پوچھا گیا کہ کیا بری چیز؟ تو فرمایا کہ نے یہ سوچا کہ میں حضور ﷺ کو چھوڑ دوں۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے اس قدر طویل قیام فرمایا کہ حضرت ابن مسعود کو تو اس کی طاقت بھی نہ تھی۔ یہ حضور ﷺ کا عام معمول تھا۔ آپ ﷺ بخشے بخشائے تھے اور آپ کو اللہ نے سب سے اونچا مقام عطا فرمایا تھا؛ لیکن اس کے باوجود آپ ان چیزوں کا اہتمام فرماتے تھے۔

حضرات شیخینؓ کا قیام اللیل اور تلاوت

حضور اکرم ﷺ نے جن حضرات صحابہ کی تربیت فرمائی، اس پوری جماعتِ صحابہ میں کسی کی بھی زندگی کو آپ کتابوں میں دیکھ لیجیے، مطالعہ کر لیجئے، خصوصاً وہ عالی مرتبت حضراتِ صحابہ، جن کا خاص مقام ہے ان کے حالات دیکھیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر، حضرت عمرؓ وغیرہ۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صبح کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا، ابوبکر! میں رات کو تمہارے پاس سے گذرا تو آپ قیام اللیل میں قرآن آہستہ آہستہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! **أسمعت من ناجيتُ**، میں جس ذات سے سرگوشی کر رہا تھا اسی کو سنا رہا تھا۔ یعنی اللہ ہی کو میں سنا رہا تھا اور وہ میری تلاوت یقیناً سن رہے تھے۔

حضرت عمرؓ سے فرمایا اے عمر! میں تمارے پاس سے گذرا تو آپ بہ آواز قرآن پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا **أُوقِظُ الوَسنَانَ و أَطرُدُ الشَّيطَانَ**۔ کہ میں سوئے لوگوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا، آپ اپنی آواز کچھ بلند کریں، اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ آپ اپنی آواز کو کچھ پست کریں۔ (ترمذی، کتاب الصلاۃ ،ابواب السھو: ۴۰۹)

مکہ میں حضرت ابوبکرؓ کی تہجد اور تلاوت

ان حضرات کا یہ معمول تو مکہ مکرمہ سے جاری تھا۔ بخاری شریف میں واقعہ مذکور ہے: حضرت ابوبکرؓ نے اپنے گھر کے باہر چبوترہ بنایا تھا۔ رات کو اس پر کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہوئے قرآن کی جو تلاوت کرتے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ مشرکین کو اس سے اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ہماری عورتیں اور بچے اس دین میں داخل نہ ہو جائیں، اس لیے انہوں نے اپنی ایذا رسانی کا سلسلہ بڑھا دیا، حضرت ابوبکرؓ نے اس سے تنگ آ کر نبی کریم ﷺ سے اجازت چاہی کہ اے اللہ کے رسول! ان کی تکلیفیں اب برداشت سے باہر ہیں، آپ مجھے اجازت دیجئے، میں مکہ چھوڑ دوں، حضور ﷺ نے اجازت دے دی اور وہ سفر پر روانہ ہو گئے۔

راستے میں قبیلہ قارہ کا سردار ابن الدَغِنہ ملا۔

پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟

کہا کہ قوم نے اتنی تکلیفیں پہنچائیں کہ وہ اب برداشت کی حد سے آگے ہیں۔

ابن الدغنہ کہنے لگا کہ آپ جیسا آدمی مکہ چھوڑ کر جائے گا تو کیسے بات بنے گی؟ پھر وہ مشہور کلمات کہے کہ **إنک لتصل الرحم، و تحمل الکل، و تکسب المعدوم و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق** اس نے حضرت ابوبکرؓ کی بھی وہی خوبیاں بیان فرمائیں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل کے ہونے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمائی تھیں۔

وہ کہنے لگا کہ آپ جیسا آدمی چلا جائے یہ ممکن نہیں، لہٰذا میں آپ کو امن دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ آپؓ کو واپس لے آیا اور مکہ کے بڑے لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ میں ان کو پناہ دیتا ہوں۔ اس پر مکہ والوں نے کہا کہ آپ کی پناہ کو کوئی توڑ نہیں سکتا؛ لیکن ایک بات ہے، اپنے گھر کے باہر انہوں نے ایک چبوترہ بنا رکھا ہے اور اس پر اس طرح رات کو نماز پڑھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، جس سے ہمیں اپنے بچوں اور عورتوں کے متعلق اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ان کے گرویدہ نہ ہو جائیں، اس لیے آپ ان کو تاکید کر دیں کہ یہ گھر میں پڑھیں۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا تو آپ نے بھی منظور کر لیا۔ تھوڑے دنوں تک تو اس پر برابر عمل ہوا؛ لیکن آپؓ سے یہ برداشت نہیں ہوا اور رہا نہیں گیا اور آپؓ نے پھر اسی چبوترہ پر آ کر عبادت و تلاوت شروع کر دی۔ مکہ والوں نے ابن الدغنہ سے جا کر شکایت کی کہ دیکھو، انہوں نے پھر یہ سب شروع کر دیا۔ اس نے آ کر حضرت ابوبکرؓ سے کہا ان کی شکایت دہرائی اور اپنی امان کا ذکر کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تم اپنی امان واپس لینا چاہو تو لے لو، میں تو اسی طرح

نماز اور قرآن پڑھوں گا۔ بخاری: کتاب الکفالۃ ۲۱۷۶)

حضرت عثمانؓ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ ایک رات میں پورا قرآن پاک تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ (فتح الباری، کتاب الوتر، باب ما جاء فی الوتر) حضرت ابوبکرؓ، حضرت، عمرؓ، حضرت علیؓ اور تمام صحابہ۔ کون سا صحابی ایسا ہے جو اس کا اہتمام نہ کرتا ہو۔ پھر حضرات تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین سب کا یہ معمول تھا۔

انسانی قلوب پر اختلاط وصحبت کا اثر

انسان کے یہ قلوب اللہ نے ایسے بنائے ہیں کہ جب ایک دوسرے کے ساتھ ملتے جلتے ہیں تو ایک قلب کا اثر دوسرے قلب پر آتا ہے۔

آپ نے کتنے ہی مجاہدہ کیے ہوں، کتنی ہی ریاضتیں کی ہوں، مجاہدوں اور ریاضتوں کے ذریعہ اپنے قلب کو کتنا ہی مجلی اور مصفی کیا ہو، لیکن جب آپ لوگوں کے مجمع میں جائیں گے تو ان کے قلوب کے اثرات آپ کے قلب پر پڑیں گے، اور ریاضت اور مجاہدہ کی وجہ سے مجلی اور مصفی ہونے کے باوجود، وہ کدورتیں آپ کے قلب پر اپنا اثر دکھلائے گی۔

حدیث میں آتا ہے کہ **إنه ليغان على قلبي** (مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب الاستغفار: ۲۷۰۲)

یہ لیغان کیا تھا؟ یہی کہ مخلوق کے قلوب کے اثرات پڑتے ہیں۔

آپ نے پڑھا ہوگا کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے،

قراءت میں غلطی ہوگئی، آپ نے نماز کے بعد فرمایا: تم میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو طہارت میں کمی رکھتے ہیں، یہ اس کا اثر ہے۔ گویا صحابہ کی جماعت کا ایک آدمی اس تاثیر کا سبب بنا۔ اور طہارت میں کمی کیا تھی؟ ناک منہ وغیرہ میں اندر تک پانی پہنچانے میں جو اہتمام ہونا چاہیے وہ نہ تھا، نسائی (۹۴۷) کی روایت میں ہے، مشکوۃ میں بھی موجود ہے۔ (کتاب الطہارۃ: ۲۹۵)

جب نبی کریم ﷺ کے قلب اطہر پر اتنا اثر پڑ رہا ہے، کہ آپ کی قراءت میں اس کی وجہ سے الجھن پیدا ہوئی، غلطی ہوئی، تو آپ اندازہ لگائیں کہ مخلوق کے ساتھ اختلاط کی وجہ سے ہمارا اور آپ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟

اختلاط کے اثر کا ازالہ۔

درس وتدریس، دعوت وتبلیغ، تعلیم، قرآن کا پڑھنا پڑھانا، اور دیگر جتنے بھی کام ہوں، ان کاموں کے انجام دینے کے لیے جب لوگوں کے ساتھ ہم ملیں گے تو ان کے قلوب کے اثرات پڑیں گے، اور جو کدورتیں آئیں گی، ان سے قلب کو صاف کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ رات کے وقت سب سے الگ ہو کر ہم اللہ تعالی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ جب تک یہ نہیں کریں گے، قلب کی کدورتیں دور نہیں ہوں گی۔

ہمارے حضرت مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کا مقولہ نقل فرمایا کرتے تھے، حضرت کہتے تھے کہ جب کسی اجتماع میں، میوات میں، یا کہیں اور دو تین دن کے لیے جانا ہوتا ہے تو وہاں سے آنے کے بعد، اگر وقت ہو تو

سہارنپور یا رائے پور خانقاہ میں جاتا ہوں، اور اگر وقت نہیں ہوتا تو نظام الدین میں رہتے ہوئے تین دن کا اعتکاف کر لیتا ہوں تا کہ اس اجتماع کی شرکت اور لوگوں سے اختلاط اور ملنے جلنے کی وجہ سے قلب پر جو کدورتیں آئیں ہیں وہ صاف ہو جائیں۔ آپ بیتی میں حضرت شیخؒ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے اس مقولہ کو نقل فرمایا ہے۔

مؤثر پر متأثر کا اثر

میں اس کو ایک مثال دے کر سمجھاؤں تا کہ بات واضح ہو جائے کہ یہ اثرات کیسے آتے ہیں۔

دیکھئے! ایک ہوتا ہے مؤثر یعنی اپنا اثر ڈالنے والا۔

اور ایک ہوتا ہے متأثر، اس اثر کو قبول کرنے والا۔

ظاہر میں اگر چہ مؤثر اپنا اثر ڈال کر اپنا کام انجام دیتا ہے؛ لیکن اس دوران متأثر کا بھی کچھ اثر ادھر مؤثر کی جانب ضرور پہنچتا ہے، آپ چھری چاقو سے سبزی یا پھل کاٹیں گے تو چاقو کی دھار اپنا اثر کر کے اس پھل کو کاٹتی ہے۔ آپ جب ایک دن دو دن تک اس چاقو سے پھل کاٹتے رہیں گے، تو بھلے چاقو نے اپنی تاثیر سے ان پھلوں کو کاٹا اور اپنا کام انجام دیا؛ لیکن کٹنے والے پھلوں نے بھی اپنا کچھ اثر چاقو پر ڈالا ہے اور دھار میں جو تیزی تھی اس کو ان کٹنے والے پھلوں نے کم کر دیا۔ چنانچہ تیسرے دن اس کو تیز کرنا پڑے گا، اگر آپ تیز نہیں کریں گے تو، اس کی افادیت یعنی چاقو کا عمل ماند پڑ جائے گا۔ دو دن میں تو ماند پڑے گا، اور پانچویں

دن تو وہ بالکل ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ کاٹ بھی نہیں سکے گا۔ آپ زور لگائیں گے، تو بھی اس سے وہ پھل نہیں کٹیں گے۔ چاقو کی دھار کس نے کند کر دی؟ انہی پھلوں نے، جن کو اس نے کاٹا تھا، معلوم ہوا ان کا بھی اثر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ، حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے اکابر خلفاء میں سے تھے، اور انہوں نے بھی زندگی بھر یہی اصلاحی کام کیا ہے۔ آپ کی تالیفات یعنی 'مجموعہ تالیفات مصلح الامت' کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے عجیب وغریب مضامین بیان فرمائے ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں آج کل کے مریدین تو شیخ کے پاس آکر ان کے اوقات کو ایسا ضائع کرتے ہیں کہ اس بیچارے کو بھی اونچے مقام سے نیچے اتار دیتے ہیں، یعنی اس کو اپنے معمولات ادا کرنے کا موقع نہیں دیتے، جس کی وجہ سے اللہ کے یہاں جو قرب کا مقام حاصل تھا اس میں کمی آجاتی ہے۔ مریدین خود تو کیا کرتے؟ عجیب وغریب ارشاد فرمایا ہے۔

حضرت نے، ہم لوگوں کے لیے بڑی عبرت کی بات کہی ہے، ہم لوگ، لوگوں کے ساتھ مل جل کر اپنے معمولات، تلاوت چھوڑ دیتے ہیں، تسبیح ذکر چھوڑ دیتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ کیا ہو جائے گا؟ اس سے کیا کچھ ہوتا ہے وہ بعد میں پتہ چلتا ہے۔

قیام اللیل اللہ کا خاص حق ہے۔

بہر حال کہنے کا حاصل یہ ہے کہ ہم جن کاموں کو انجام دیتے ہیں، یقیناً یہ اللہ کا

حکم ہے، لوگوں کو قرآن پڑھاتے ہیں، احکام سے واقف کرتے ہیں، ایمان و اسلام کی دعوت پیش کرتے ہیں، یہ سب جتنے بھی دینی کام ہیں، وہ یقیناً اللہ کے کام ہیں؛ لیکن یہ مشغولیت مخلوق کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کا مطالبہ باقی ہے کہ آپ کچھ وقت میرے لیے بھی فارغ کرو۔

میں مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک آدمی کی شادی ہوئی، شادی کے بعد جب تک بچہ نہیں پیدا ہوتا، وہاں تک میاں بیوی ایک دوسرے کی طرف ہنڈریڈ پرسنٹ (سو فیصد) متوجہ ہیں؛ لیکن جب بچہ پیدا ہوگا تو بیوی بچہ کی ساخت، پرداخت، اور پرورش میں مشغول ہوگی۔ کبھی اس کو نہلا دھلا رہی ہے، دودھ پلا رہی ہے، اس کو سلا رہی ہے، اس کو کھلا رہی ہے۔ اس حال میں اگر شوہر یوں کہے کہ تم تو اس میں لگ گئی، میری طرف کچھ دھیان نہیں دیتی، تو بیوی اس کے جواب میں یہی عرض کرے گی کہ جس کی خدمت میں لگی ہوں، یہ کون ہے؟ یہ آپ کا ہی تو بیٹا ہے۔ آپ کے ساتھ میرا جو تعلق ہے اور آپ کے جو میرے اوپر حقوق ہے انہی حقوق کی ادائیگی کے لیے میں یہ سب کام کر رہی ہوں۔ بادی النظر میں یہ جواب درست ہے، مگر بچہ کی خدمت کے علاوہ بھی شوہر کے خاص حقوق بیوی پر لازم ہیں، لہٰذا شوہر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے پھر بھی ضرورت ہے کہ ذرا میری طرف بھی توجہ دو،

اس طرح ہم اور آپ؛ اگر اپنے آپ کو مکمل دین کی خدمت میں مشغول رکھتے ہیں تو یہ اللہ ہی کا کام ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں؛ لیکن ضرورت ہے کہ خاص اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اور اس کی یاد میں مشغول ہونے کے لیے اپنے اوقات فارغ کریں۔

دینی کاموں کو نتیجہ خیز بنانے کے اسباب

ایک دوسری بات بھی یاد رکھیے۔

اگر یہ خاص کام نہیں ہوگا، اور اللہ کی طرف رجوع و انابت کے لیے اپنے اوقات کو فارغ نہیں کریں گے، تو خدمتِ دین کے ہمارے یہ سب کام چند دنوں تک اثر کریں گے، بعد میں وہ ایک ڈھانچہ رہ جائے گا اور اس کے اندر روح نہیں رہے گی۔

اس میں روح باقی رکھنے کے لیے ہمارے اسلاف اور اکابر کیا کرتے تھے۔

ان کی زندگیوں کا ہم مطالعہ کریں، ہم جن کاموں کو انجام دیتے ہیں اس میں تو ان کا بار بار حوالہ دیتے ہیں، اور یوں کہتے ہوئے ان کی طرف نسبت کرتے ہیں کہ وہ پڑھاتے تھے، انہوں نے دین کی خدمت کی، انہوں نے یہ کیا، وہ کیا؛ لیکن وہ راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے، روتے تھے، ذکر میں مشغول رہتے تھے، ان کی راتوں کا بڑا حصہ دن کے سارے مشاغل کے باوجود للہ کی عبادت میں گذرتا تھا، اس پہلو کو ہم اجاگر نہیں کرتے۔ چھپا دیتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ہم نہیں جانتے، ہم ان کی سوانح پڑھتے ہیں، یہ ساری چیزیں ہمارے علم میں ہیں؛ لیکن چوں کہ یہ ہمارے مزاج سے موافقت نہیں رکھتیں، اس لیے نہ تو اس کو ہم عملی جامہ پہناتے ہیں، نہ لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی عشاء کے وضو سے فجر کی نماز

امام ابوحنیفہؒ: ہم اور آپ ان کی تقلید کو اپنے لیے فخر سمجھتے ہیں۔ ان کے متعلق

ہم اورآپ سب جانتے ہیں کہ آپ نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا فرمائی۔کبھی ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ چالیس سال نہ سہی، چالیس دن نہ سہی، ایک دن کم سے کم ایسا کر کے دیکھیں۔کبھی ایسا سوچا بھی نہیں کہ ہم ایک رات ایسا کریں کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا ہو۔اس طرح عبادت میں مشغول رہیں۔

امام صاحبؒ کے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ پہلے آپؒ کا یہ معمول نہ تھا۔البتہ ایک مرتبہ جارہے تھے،تو سنا کہ ایک آدمی دوسرے کو کہہ رہا تھا کہ: یہ جوان عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔آپ کے کان میں یہ آواز پڑی تو آپ نے سوچا کہ لوگ تو میرے متعلق یہ خیال کرتے ہیں اور میں تو ایسا نہیں ہوں۔چنانچہ اسی دن سے آپ نے رات بھر عبادت کرنا شروع کردی۔(مناقب الامام وصاحبیہ،شمس الدین ذہبی،ص:۲۱) گویا ایک جملہ ان کی زندگیوں میں تبدیلی لانے کے لیے اور کسی نیکی پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہوجاتا تھا۔ہم تو ایسے سینکڑوں جملے سنتے ہیں ،تو بھی ہمارے دل میں کبھی گرمی پیدا نہیں ہوتی اور غیرت نہیں آتی۔

جن حضرات محدثین کی ترتیب دادہ کتابوں کو ہم پڑھتے ہیں جیسے کہ امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ان سب کے حالات پڑھ لیجئے۔ان کی حدیثوں کے رواۃ، اوردیگر اکابر حضرات کی زندگیاں اور راتیں کیسی گذرتی تھیں؟

ماضی قریب کے اسلاف واکابر کا معمول

ہمارے اسلاف واکابر،جن کی طرف اپنی نسبت کو ہم اپنے لیے فخر سمجھتے ہیں،

چاہے حضرت نانوتوی ہوں، حضرت گنگوہی ہوں، یا حضرت شیخ الہند ہوں، حضرت رائے پوری ہوں، حضرت سہارنپوری ہوں، حضرت تھانوی ہوں، اور ان کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی ہوں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ہوں، یا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ ہوں؛ یہ سارے حضرات اور ان کے بعد کے ہمارے جن اکابر کو ہم نے دیکھا، ان کی زندگیوں کو بھی دیکھ لیجئے، کہ وہ حضرات کبھی اس میں کوئی کوتاہی وکاہلی کرتے تھے؟

حضرت مولانا قاری صدیق صاحب رحمہ اللہ

حضرت مولانا قاری صدیق صاحبؒ کے ساتھ کئی مرتبہ سفر میں رہنا ہوا۔ جب گجرات آتے اور دورہ ہوتا تھا تو رات کو ایک بجے، ڈیڑھ بجے قیام گاہ پر واپس لوٹنا ہوتا تھا اور دن بھر سفر میں گذرتا تھا، اس کے باوجود بھی تین ساڑھے تین بجے نہیں کہ اٹھ گئے اور اپنے کام میں لگ گئے۔ کسی بھی سفر میں ہوں، ان معمولات کا بڑا اہتمام رہتا تھا۔ کبھی اس میں کمی نہیں دیکھی گئی۔ ہمارے یہ اکابر سفر میں ہوں کہ کسی حال میں ہوں، اس عمل کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سوانح کا مطالعہ فرمائیں۔

مولانا عبداللہ کاپوری صاحب فرماتے ہیں کہ گجرات میں ایک بار ان کا دورہ ہوا، کاپودرہ میں قیام تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ رات کو عشا کے بعد بیانات ہوتے

تھے۔حضرت کا معمول لمبا بیان کرنے کا تھا۔دن بھر سفر میں مشغول رہتے تھے۔ اور ۱۱، ۱۲ یا ایک بجے قیام گاہ پر آتے۔سب سو گئے، حضرت بھی لیٹ گئے؛ لیکن دو بجے، ڈھائی بجے جب کہ سب پڑے ہوئے ہیں، آپ اٹھ جاتے تھے۔دن بھر کی مشغولی، اسفار، مشقت اور مجاہدہ، رات کو دو ڈھائی بجے ان کے اٹھنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔اور بڑے شوق اور رغبت سے اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔یہی وہ چیز تھی جس نے ان کو اللہ کے دربار مقبولیت عطا فرمائی اور ان کی خدمات سے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔

حضرت شیخ الہندؒ

حضرت شیخ الہندؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں قیام اللیل کی وجہ سے آپ کے پاؤں میں ورم آ گیا تو آپ بہت خوش ہوئے کہ ایک سنت پر غیر اختیاری طور پر عمل ہو گیا، ان حضرات کی تو پوری زندگی اس طرح گذری۔

مولانا احمد شاہؒ کا زہد اور ستاون سالہ تہجد کی پابندی

ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہ کی زبانی یہ واقعہ سنا، اور حضرتؒ براہِ راست حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب سے سن کر بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا احمد شاہؒ، حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے تھے۔حسن پور، مراداباد کے رہنے والے تھے۔ان کا کوئی منتسب اور مرید کلکتہ میں رہتا تھا۔وہ گھر بنانا

چاہتا تھا، جس کی بنیاد ڈالنے کے لیے آپ کو دعوت دی۔ چوں کہ آپؒ بوڑھے تھے، اس لیے اس نے آپؒ سے عرض کیا کہ اپنے ساتھ سفر میں رفیقِ سفر کے طور پر کسی اور کو بھی لے آویں۔ چنانچہ حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ کو ساتھ لے گئے۔ حضرت مولانا احتشام الحسن صاحبؒ، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے سالے (برادرِ نسبتی) تھے، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع فرمایا تو ابتداء سے آپ کے ساتھ شریک کار تھے۔ حضرت مولانا افتخار صاحب جو اس وقت کاندھلہ میں موجودہ ہیں - حضرت مولانا طلحہ صاحب کے خسر - ان کے بڑے بھائی اور مولانا الیاس صاحبؒ کے اور حضرت شیخؒ کے بھی سالے (برادرِ نسبتی) ہوتے تھے۔ تاریخ مشائخ کاندھلہ انہی کی لکھی ہوئی ہے۔

مولانا احمد شاہؒ نے ان کو اپنے ساتھ لیا اور جب سفر شروع کیا تو فرمایا کہ مولوی صاحب! دیکھو، آپ تو عالم بھی ہیں اور جوان بھی ہیں۔ اور نبی ﷺ کی تاکید ہے کہ سفر میں کسی ایک کو امیر سفر بنایا جائے، لہٰذا میں آپ کو امیر سفر بناتا ہوں۔ وہ منع نہیں کر سکتے تھے، بلا چوں و چرا مان لیا اور سفر شروع ہوا۔ پھر انہوں نے سفر کا مقصد بتایا کہ میں آپ کو اپنے ساتھ اس لیے لے جاتا ہوں کہ وہاں مکان کی تعمیر ہونے والی ہے، اور داعی نے بنیاد رکھنے کے لیے بلایا ہے۔ آپ عالم ہیں، صالح ہیں اس لیے میں آپ کے ہاتھ سے بنیاد رکھوانا چاہتا ہوں۔

بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے، سوار ہونے کے بعد اتفاق کی بات کہ حضرت مولانا احمد صاحبؒ کو دست شروع ہو گئے، اتنے دست آئے کہ اس کے سبب سے بے انتہا نقاہت ہو گئی۔

حضرت مولانا احتشام الحسن صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ حضرت ! آپ کا بنایا ہوا یہ امیر آپ کو یہ حکم کرتا ہے کہ آج آپ تہجد نہیں پڑھیں گے۔ انہوں نے یہ سمجھ کر ایسا کہا کہ اتنی کمزوری میں ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ہمارے حضرت نے سنایا کہ مولانا احتشام الحسنؒ فرماتے ہیں کہ میں تو یہ کہہ کر سو گیا۔ رات کو اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلا رہا ہے، میں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ حضرت مولانا احمد شاہؒ، زار و قطار رو رہے ہیں، اور آنسو اُن کے رخسار اور ڈاڑھی پر بہہ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ حضرت گنگوہی کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے تہجد پڑھنے کی اجازت دے دو، ستاون سال ہوئے، جب سے حضرت کے ہاتھوں بیعت ہوا ہوں، آج تک کبھی تہجد ناغہ نہیں ہوئی۔ مولانا احتشام الحسن صاحب فرماتے ہیں کہ میں تو یہ سب دیکھ کر ایک دم گھبرا گیا، اور فوراً کہہ دیا حضرت آپ پڑھیے۔

کلکتہ پہنچے، اور پہنچنے کے بعد جہاں بنیاد رکھی جانی تھی وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بڑا گہرا گڑھا تھا اور اترنے کی سیڑھی رکھی گئی تھی۔ حضرت مولانا احمدؒ، یہاں سے تو مولانا احتشام الحسن صاحبؒ کو بنیاد رکھوانے کا کہہ کر لے گئے تھے؛ لیکن وہاں جا کر ان کو پوچھا بھی نہیں، خود گڑھے میں اتر گئے اور جا کر اندر اینٹ رکھی، دعا کی اور باہر آ گئے۔

اسی دعوت کے دوران ایک مرتبہ صاحبِ خانہ نے آپ کو ایک بڑی رقم ہدیہ میں پیش کی تو آپؒ نے اس کو رد کر دیا اور پھر نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے

، وہاں کوئی مصلّی ملا اور اس نے دو چار روپیے ہدیہ میں دیے، وہ قبول کر لیے۔

مولانا احتشام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ واپسی کے وقت میں نے پوچھا کہ حضرت! آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ آپ تو مجھے یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ تیرے ہاتھ سے بنیاد رکھواؤں گا، وہاں تو آپ نے مجھے پوچھا بھی نہیں اور خود اتر گئے۔ فرمایا کہ ہاں بھئی! جب وہاں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ کھڈا بڑا گہرا ہے، مجھے ڈر ہوا کہ کہیں اس میں جا کر کوئی گر نہ جائے اور ختم نہ ہو جائے۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ میں تو بوڑھا ہوں، ویسے بھی میری زندگی ختم ہو رہی ہے، تم نوجوان ہو، عالم دین ہو، اللہ کو آپ سے بہت کام لینا ہے، اس لیے میں نے آپ کو اندر اتارنا مناسب نہیں سمجھا اور خود اتر گیا اور بنیاد رکھ دی۔

مولانا احتشام الحسن صاحبؒ نے پھر پوچھا کہ صاحبِ خانہ نے آپ کو ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہیں فرمایا اور مسجد میں دیا گیا ہدیہ قبول فرمالیا۔ تو ارشاد فرمایا کہ اصل میں میرے اوپر بڑا قرضہ ہے، ایک مدت سے میں دعا کر رہا تھا کہ اللہ تعالی میرا یہ قرضہ ادا کروادیں۔ جب یہ دعوت آئی تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ تیرے قرضے کی ادائیگی کا اللہ نے انتظام کر دیا۔ یہ اشراف نفس ہوا۔ اس لیے میں نے وہ ہدیہ قبول نہیں کیا، اور مسجد میں دو چار روپئے کسی نے دیے اس میں کوئی اشراف نہیں تھا۔ نماز کے لیے گئے تھے اور خیال بھی نہ تھا کہ کوئی اس طرح ہدیہ دے گا۔

دیکھئے! ہمارے اکابرین کے ایک ایک عمل میں ہمارے لیے کیسے بڑے نمونے ہیں۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

ہر ایک کا انداز الگ تھا، ہر ایک کی اپنی الگ خوشبو تھی، 'ہر گلے را رنگ و بوئے دیگرست'؛ لیکن ایک چیز جو قدرِ مشترک تھی وہ راتوں کو اٹھ کر کے اللہ کے سامنے رونا اور اللہ کی عبادت کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

حضرت تھانویؒ کے ملفوظات میں دیوبند کے مدرسہ کے متعلق ہے کہ اس کا یہ حال تھا کہ رات کے آخری حصے میں ہر کمرے سے ذکر کی آواز آتی تھی اور شیخ الحدیث، صدر المدرسین سے لے کر دربان تک تمام صاحب نسبت ہوا کرتے تھے۔

ہمارے اکابر کی یہ چیزیں کیا ہمارے سامنے نہیں۔ ہمیں ان کی سوانح کا مطالعہ کر کے ان اسباب کی کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالی نے ان کے ذریعہ دین اور علم دین کی اشاعت اور حفاظت کی جو عظیم خدمات لیں، ان کے بنیادی اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ رجوع الی اللہ، اور انابت الی اللہ ہے۔ یہی بنیادی چیز ہے، مگر آج ہم اس کو ٹچ کرنے کے لیے تیار نہیں اور ہم نے اسے بھلا دیا ہے۔

صبح کی سستی شیطانی افسون کا اثر ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ تہجد کے پابند ہوتے ہیں وہ بڑے نشیط، چاق وچوبند اور ہر وقت فریش (Fresh) نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کے اوپر سستی کا غلبہ نہیں ہوتا اور اپنے کاموں کو بڑی چستی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

بخاری شریف (کتاب التہجد: ۱۰۹۱) کی روایت ہے کہ آدمی جب سو جاتا ہے تو شیطان "علی قافیۃ رأسہ" آدمی کی گدّی پر تین گرہیں لگاتا ہے، اور ہر گرہ کے اندر یہ افسون پڑھتا ہے کہ **علیک لیل طویل، ارقد۔** سو جا، رات بڑی لمبی ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آدمی کی جب آنکھ کھلتی ہے تو یہ سوچ کر کہ ابھی بہت دیر ہے دوبارہ چادر کھینچ لیتا ہے۔ یہ شیطان کے اسی جادو کا اثر ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدمی اٹھ کر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، اس کے بعد جب وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھلتی ہے، پھر جب نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے اور انسان **فأصبح نشیطا طیب النفس**، یعنی بالکل چاق و چوبند اور ہشاش بشاش حالت میں صبح کرتا ہے۔ اگر یہ گرہیں نہ کھولی جائیں تو اس کی صبح ایک دم سستی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

طبرانی کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں، **فحلوا العقد کلھا و لو برکعتین** کہ شیطان کی لگائی ہوئی ان ساری گرہوں کو کھول دو، چاہے دو رکعت کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ تہجد کے لیے جب اٹھتے تھے تو دو ہلکی رکعت ادا فرماتے تھے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کی توجیہ میں یہ عجیب نکتہ فرمایا ہے کہ چوں کہ اٹھنے کے بعد اس پہلی نماز میں ابھی تیسری گرہ کھلی نہیں ہے، وہ تو دو رکعت کے بعد کھلے گی، اس لیے اس میں کچھ شیطانی اثر موجود ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ پہلی دو رکعت ہلکی پڑھتے تھے، اس کے بعد طویل نماز ادا فرماتے تھے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام اللیل کی

تاکید فرمارہے ہیں اور ہمیں اس کی طرف متوجہ فرمارہے ہیں۔

کوئی ہے؟

ایک اور حدیث میں ہے:

جب رات کا اخیری تہائی حصہ رہ جاتا ہے تو اللہ تعالی آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

من یدعونی، **فأستجیب له**، کوئی ہے مجھ سے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟

من یسئلنی، **فأعطیه**، کوئی ہے مجھ سے مانگنے والا کہ میں اس کی ضرورت پوری کروں؟

من یستغفرنی، **فأغفر له**، کوئی ہے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہنے والا کہ میں اس کے گناہوں کو معاف کروں؟

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ، حضرت حکیم الامتؒ کے اکابر خلفاء میں سے تھے، فرماتے تھے کہ بھئی کسی جگہ اعلان ہو جائے کہ آج یہاں کا حاکم، گورنر، کلکٹر آنے والا ہے، اور جو درخواستیں پیش کی جائیں گی اس کو قبول کرے گا، تو لوگ دو دن پہلے سے لائن لگا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں اللہ رب العزت، مالک الملک اور ساری کائنات کا پیدا کرنے والا، رات کے اخیری حصے میں اس طرح اعلان کر رہا ہے اور ہم غفلت کی نیند پڑے سوتے رہتے ہیں، یہ انتہائی بے غیرتی کی بات ہے۔ اس لیے ہمیں ضرور اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

یاد رکھیے، یہ سب ڈھانچے ہیں، جن کو لے کر ہم پھرتے رہیں گے اور پھر کل کو قیامت میں پتہ چلے گا کہ ہم ایک کھوٹی پونجی کو حقیقت سمجھ کر کے زندگی بھر اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی دربار نبوت میں پہلی حاضری

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مواقع میں اس کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے اسلام کا واقعہ ترمذی میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لیے آپ کی مجلس میں حاضری دینے کے لیے گئے تو سب سے پہلا کلام جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کے کان میں پڑا تھا وہ یہ تھا؟ یا أیھا الناس افشو السلام، اطعموا الطعام، صلوا الأرحام، صلو ابالليل و الناس نيام؛ تدخلوا الجنة بالسلام۔ (ترمذی، صفة القيامة والرقائق: ۲۴۸۵)

چار چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر فرمائیں، اس میں ایک صلوا باللیل والناس نیام ہے۔ رات کو نماز پڑھو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں۔

فيم يختصم الملأ الأعلى؟

ترمذی شریف (کتاب التفسیر، سورۃ النساء، ۳۱۷۶) میں ایک بڑی طویل روایت حضرت انسؓ کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو خواب میں نوجوان کی شکل میں دیکھا اور اس وقت مجھ سے پوچھا گیا کہ فیمَ

یختصِمُ الملأ الاعلی، ملأاعلی والے کاہے کی بحث کررہے ہیں؟ کاہے کا چرچا کررہے ہیں؟ تو میں کوئی جواب نہیں دے سکا۔ تو اللہ تعالی نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنی پشت پر محسوس کیا اور اس کے بعد پھر سوال کیا گیا: **فیم یختصم الملأ الاعلی**؟ ملأاعلی والے کس چیز میں بحث اور چرچا کر رہے ہیں، میں نے جواب میں عرض کیا: **فی الدرجات**، ان اعمال کے سلسلے میں جن کو انجام دینے کے نتیجہ میں آدمی کے درجات بلند ہوتے ہیں۔

پوچھا گیا: **وما هی**؟ وہ درجات کیا ہیں؟ تو جواب میں فرمایا کہ **اطعام الطعام و لین الکلام و الصلوۃ باللیل و الناس نیام**۔ تین چیزیں ہیں۔ اس میں الصلوۃ باللیل والناس نیام کو ذکر فرمایا۔

شرف المؤمن قیام اللیل

ایک مرتبہ حضرت جبریل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور آکر عرض کیا کہ اے محمد، **شرف المؤمن قیام اللیل**، ایک مومن کے لیے شرف اور بزرگی کی چیز کیا ہے وہ بتاؤں؟ وہ رات کا قیام ہے۔ (مستدرک علی الصحیحین: ۷۹۹۱)

قیام اللیل کے پانچ فائدے

نبی کریم ﷺ کا ارشاد جو میں نے شروع میں پڑھا، اس کی ایک روایت حضرت امامہ رضی اللہ عنہ سے ہے، جو ترمذی (کتاب الدعوات ۳۵۴۹) میں ہے اور اس میں اخیری جز: **مطردة اللداء عن الجسد** نہیں ہے، پہلے چار جز ہیں، اس لیے

میں نے وہ نہیں پڑھی، اور میں نے جو پڑھی وہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت طبرانی شریف کی ہے۔ ترمذی میں ہی میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی حدیث (کتاب الدعوات ۳۵۴۹) میں پانچوں جملے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

عليكم بقيام الليل تم رات کے قیام کو لازم پکڑلو۔

فإنه دأب الصالحين قبلكم تم سے پہلے جو صالح اور نیک لوگ گذرے ہیں، یہ ان کا طریقہ رہا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ اگر ہم بھی اپنے آپ کو صالحین کی جماعت میں اور صالحین کے زمرے میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو پھر اس کو لازم پکڑنا پڑے گا، اس کے بغیر بات بننے والی نہیں۔

آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: **و مقربة لكم إلى ربكم** اور تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے قرب اور نزدیکی کا ذریعہ ہے۔

و مغفرة للسيئات اور گناہوں کے کفارے کا اور معافی کا ذریعہ ہے۔

و منهاة عن الإثم گناہوں سے اور اللہ کی نافرمانی سے روکنے والا ہے۔

دن میں ہم سے اللہ کی نافرمانیاں سرزد ہو ہی جاتی ہیں، دینی اعتبار سے اتنا اونچا مقام اللہ نے دیا ہے تو بھی ہماری نگاہ کبھی بھٹک جاتی ہے، ہم قابو نہیں کر پاتے۔ ہم چاہتے بھی ہیں کہ ہم سے گناہ کا صدور نہ ہو؛ لیکن چاہنے کے باوجود ہم گناہ سے رک نہیں پاتے، ہم خود میں گناہ سے رکنے کی طاقت اور ہمت نہیں جتا پاتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی ہمت پیدا کرنے کے جو اسباب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائے ہیں وہ اختیار کرنے ہوں گے اور ان میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔ ہم قیام اللیل کا اہتمام کریں گے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالی ہم کو وہ قوت

عطا فرمائے گا کہ اس قوت کی وجہ سے ہم اپنے نفس اور شیطان کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرلیں گے۔

اور اخیری بات: **مطردة للداء عن الجسد** جسم سے بیماری دور کرنے والی ہے۔لو بھائی، دنیوی فائدہ بھی اس میں ہے۔ یہ تو ہم خرمہ اور ہم ثواب والی بات ہوئی۔

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، اپنے زمانے کے بڑے مشہور ادیب بھی ہیں اور بڑے عالم بھی۔ایک پرچہ نکالتے تھے،'صدق' آپ نے تو نہیں دیکھا ہوگا،ہم نے دیکھا ہے۔ ان کا قلم تو بڑا زوردار تھا؛ لیکن 'صدق' پرچے (رسالہ) کو دیکھو بہت سادہ،آج کل کا کوئی آدمی دیکھ کر ہی رکھ دے کہ ایسا ہی کوئی پرچہ ہوگا۔

لیکن اس کے مضامین کی وجہ سے بڑے بڑے لوگ اس کے خریدار تھے۔انہوں نے اس کے ایڈیٹوریل (Editorial) یعنی اداریہ میں ایک مرتبہ خاص طور پر یہ لکھا تھا کہ جو لوگ قیام اللیل کا اہتمام کرتے ہیں وہ بہت ساری بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

حکیم محمود چغتائی، پاکستان کے بڑے مشہور مصنف ہیں، ان کا ایک رسالہ ہے،طب نبوی اور جدید سائنس۔

اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پاکستان کے شفا خانوں میں پاگل خانوں میں، پاگلوں کے علاج کے لیے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ رات میں جلدی سلا دیا جائے اور صبح کو جلدی اٹھا کر ذکر اللہ وغیرہ کروائے جائے،۔باقاعدہ اس کے

لیے آدمی مقرر کیے گئے، جوان کو جلدی سلاتے تھے، پھر اٹھاتے تھے۔

وہ فرماتے ہیں کہ اس طرح نو مہینے تک یہ طریقہ اختیار کیا گیا، تو ۸۷ فیصد پاگل صحت یاب ہو گئے۔ حالاں کہ یہ دماغی عدم توازن کی بیماری، معمولی بیماری نہیں ہوتی۔ ایک دن کی دوا آدمی چھوڑ دے تو پھر اسی طرح ہو جاتی ہے۔

قیام اللیل فتنوں سے حفاظت کا وسیلہ ہے۔

آج کل جو کچھ خرابیاں ظاہر ہو رہی ہیں، جو فتنے آ رہے ہیں، عوام الناس کے قلوب سے اہل علم کی وقعت اور قدر و قیمت گھٹتی جا رہی ہے، اس کی جو بنیادی وجوہات ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔

رات کا قیام، آدمی کو فتنوں سے بچاتا ہے، بخاری شریف (کتاب الفتن: ۶۶۵۸) میں حضرت ام سلمہؓ کی حدیث ہے۔ ایک رات جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کے یہاں قیام تھا، تو رات کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھبرا کر اٹھے اور فرمانے لگے، سبحان اللہ، **ماذا أنزل الليلة من الفتن و ماذا فتح من الخزائن،** آج کی رات کیسے بڑے بڑے فتنے نازل ہوئے، اور کیسے خزانے کھولے گئے، **من يوقظ صواحب الحجرات۔ رب كاسية في الدنيا عارية في الآخرة۔**

کون اِن صواحب حجرات – یعنی ازواج مطہرات – کو بیدار کرے گا۔

رب كاسية الخ بہت سی عورتیں دنیا میں عزت اور وقعت کے لباس میں ملبوس ہوں گی، مگر آخرت میں عریاں ہوں گی۔

اس کی شرح میں علماء نے لکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **من يوقظ صواحب**

الحجرات سے پہلے فتنوں کا تذکرہ فرمایا۔اس سے معلوم ہوا کہ فتنوں سے حفاظت کی جو مختلف شکلیں شریعت مطہرہ نے بتلائی ہے، ان میں سے ایک عظیم وسیلہ ’رات کا قیام‘ ہے۔

جو لوگ رات کا قیام ادا کریں گے، اللہ تعالی ان کو بہت سے فتنوں سے محفوظ رکھیں گے۔ یہ زمانہ فتنوں کا ہے، ہمارے لیے فتنوں سے بچنا بھی بڑا مشکل ہو گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس عمل کا اہتمام کریں اور اپنی زندگیوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرات صحابہ، اکابر و اسلاف اور ہمارے اکابرِ دیوبند کا جو انداز رہا ہے، اس کے مطابق ڈھالنے کا اہتمام کریں۔

قیام اللیل کی فضیلتیں احادیث میں کثرت سے ہیں، اہل علم مطالعہ کا اہتمام فرمائیں۔

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت کی دعا دے رہے ہیں۔لوگ بزرگوں اور نیک لوگوں کے پاس جاتے ہیں، خدمت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دعا مل جائے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اس پر خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا سے نواز رہے ہیں۔

ابو داؤد شریف کی روایت ہے۔**رحم اللہ رجلاً قام من اللیل فصلی و أیقظ امرته فإن ابت نزح فی وجهه الماء (کتاب التطوع، ابواب قیام اللیل ۱۱۱۴)**

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالہ رحم کرے اس آدمی پر، رات کو اٹھا اور نماز پڑھی، بیوی کو بھی اٹھایا اور اس نے منع کیا تو اس پر پانی چھڑکا تا کہ وہ اٹھ جائے۔

قیام اللیل میں معین اعمال

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں قیام اللیل کو آسان کرنے والی چیزوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کچھ ظاہری تدبیریں بتلائی ہیں اور کچھ باطنی اسباب بتائے ہیں۔

(۱) آدمی بہت زیادہ کھانا نہ کھائے۔ زیادہ کھانا آدمی کو نیند میں ڈال دیتا ہے اور اٹھنے سے محروم کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح دن میں تعب اور تھکاوٹ والے مشکل کام نہ کرے۔ اہل علم تو ایسے کام کرتے بھی نہیں کہ اس کی وجہ سے اعصاب پر اثر پڑے۔

(۳) گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر نہ ڈالے، گناہوں کی وجہ سے قلب میں قساوت پیدا ہوتی ہے، یہ قساوت آدمی کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیتی ہے۔

(۴) قیلولہ کا اہتمام ہونا چاہیے، چاہے نیند آئے یا نہ آئے۔

حضرت عمرؓ تو یہاں تک فرماتے ہیں **قیلوا، فإن الشیطان لا یقیل**، (معجم اوسط، من اسمہ احمد ۲۸) قیلولہ کی عادت ڈالو، شیطان قیلولہ نہیں کرتا۔ موجودہ تہذیب کی بنیاد بھی اسی شیطانی طریقے پر ہے کہ صبح کو سو جائیں گے، دوپہر کو کوئی سوتا نہیں۔

یہ چار ظاہری تدابیر تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ باطنی اسباب بھی ہیں:

(۱) کسی مؤمن کے متعلق اپنے دل میں کینہ نہ رکھے۔ دل میں جو کیڑے بھرے ہوئے ہوتے ہیں اس کی وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ ایسے اعمال صالحہ سے محروم کر دیتے ہیں۔ کبھی کوئی چھوٹا سا گناہ ہوتا ہے، ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا؛

لیکن اس گناہ کی نحوست سے ہم بہت بڑی نیکی سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ لہٰذا گناہوں سے بچنے کا بھی اہتمام فرمائیں۔

حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی روز تک تہجد کے لیے میری آنکھ نہ کھلی، اور باوجود کوشش کے میں تہجد کے لیے نہیں اٹھ پایا۔ میں نے اللہ تعالی سے دعا کی، توبہ کی، استغفار کیا اور عرض کیا: اے اللہ تعالی، کاش مجھے معلوم ہوجائے کہ میرے کس گناہ کی وجہ سے میں رات کے قیام سے محرورم کر دیا گیا ہوں۔ تو اللہ نے دل میں بات ڈالی کہ ایک آدمی دعا کر رہا تھا، اس دعا کرنے والے کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ تو بناوٹ کر رہا ہے، مرائی ہے، دکھلاوے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ اتنا سا خیال دل میں آیا، اس کی وجہ سے اللہ تعالی نے کئی روز تک تہجد سے محروم کر دیا۔ ہم تو اس باب میں ماشاء اللہ ہیں۔ دوسروں پر جب ہمارے تبصرے ہوتے ہیں تو اللہ کی پناہ۔ کوئی بیچارا صاف دل والا ہو اور وہ بیٹھ جائے تو اس کا بھی ستیاناس ہوجائے۔

(۲) اللہ کا خوف اپنے اوپر غالب رکھا جائے اور سوچتا رہے کہ اللہ تعالی میری حرکات وسکون کو دیکھ رہے ہیں۔

(۳) قیام اللیل کی فضیلتوں کو بار بار پڑھتا رہے۔

(۴) اللہ کی محبت دل پر غالب رکھے۔

ذکر کی اہمیت

قیام اللیل کے ساتھ ہی ذکر واذکار اور دعاؤں کا اہتمام بھی بہت ضروری

ہے۔ ہمارے اکابر کے یہاں ذکر اللہ کی پابندی کا بھی ایسا ہی حال تھا۔ دین کا کام کرنے والا جو بھی طبقہ ہو، اہل علم ہوں، دعوت وتبلیغ کے ساتھی ہوں، جو بھی ہوں، ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے چوبیس گھنٹے کے اوقات میں ایک بڑا حصہ اللہ کی یاد میں گذاریں۔

حضرت ڈاکٹر اسماعیل صاحبؒ نے ایک جگہ لکھا ہے حضرت شیخؒ نے اپنے ایک بڑے خلفیہ کو تاکید فرمائی کہ تم مدرسہ چلاتے ہو، دینی اور علمی کام انجام دیتے ہو، چوبیس گھنٹوں میں سے دو گھنٹے تمہارے اللہ کی یاد میں گذرنے چاہیے، جب تک کہ یہ نہیں ہوگا، وہاں تک آپ اپنے ان کاموں میں جان پیدا نہیں کرسکتے۔

قرآن میں اللہ تعالی نے ذکر کی بھی بڑی تاکید فرمائی ہے۔

یا أیھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا۔

وسبحوہ بکرۃ وأصیلا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم

آج ان چیزوں سے ہم بیگانہ ہوچکے ہیں۔ چوبیس گھنٹے میں ایک تسبیح بھی ہماری زبان پر نہیں آتی، دعاؤں کا اہتمام نہیں ہے، اللہ تعالی کے ساتھ جو رشتہ اور تعلق ہونا چاہیے، نبی کریم ﷺ کی سنتوں کے اتباع اور پیروی کا جو اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سب دینی کام رسمی بن گئے اور ان سے روح نکل گئی۔ ضرورت ہے کہ اس میں روح ڈالی جائے، اور وہ روح یہی ہے۔

ذکر اللہ کائنات کی روح ہے۔

ذکر اللہ در حقیقت پوری کائنات کی روح اور تمام عبادات کا خلاصہ اور کریم (Cream) ہے۔ نماز کو تمام عبادات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس کے متعلق بھی باری تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں، أقم الصلوة لذكرى، نماز اللہ نے کیوں مشروع فرمائی؟ اللہ کو یاد کرنے کے لیے۔ معلوم ہوا کہ جتنی بھی عبادتیں ہیں ان ساری عبادتوں کا مقصد اللہ کی یاد ہے۔

ذکر اللہ اصل ہے اور یہی بنیاد ہے جو کچھ بھی ہے اسی سے ہے، ساری کائنات بھی اسی ذکر اللہ کی وجہ سے قائم ہے، اس لیے میرے بھائیو! ضرورت ہے کہ ذکر اللہ کا بھی بڑا اہتمام ہو۔

ذکر روحانی انرجی ہے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفیؒ حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ، بھائی! یہ ذکر جو ہے، وہ تو انرجی ہے، طاقت ہے، صبح کو جب آپ ناشتہ کرتے ہیں تو اس سے پہلے ذرا ذکر بھی کر لیجئے تا کہ آپ کے اندر طاقت آئے اور اس طاقت کے ذریعہ آپ اپنے نفس اور شیطان کا مقابلہ کر سکیں۔ دن میں بہت کام کرنے ہیں، دن بھر ایسی ویسی صورتیں پیش آئیں گی۔ کہیں عورتیں ہیں اور آپ کا نفس آپ کو ابھار رہا ہے بدنظری کے لیے۔ یا آپ دکان پر بیٹھے ہوں گے اور آپ کا نفس یا شیطان آپ کو گاہک کے ساتھ دھوکہ دینے کے لیے

آمادہ کرے گا۔ ایسے سب مواقع پر نفس اور شیطان کے مقابلہ میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے ضرورت ہے طاقت کی، یہ طاقت کس سے حاصل ہوگی؟ ذکر اللہ سے۔

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت گنگوہیؒ کا ذکر

ہمارے حضرتؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب سے کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ بھائی، بڑھاپا آ گیا، سانس کمزور ہو گیا، کم ہو گیا، پھر بھی ایک سانس میں ایک سواسی (۱۸۰) ضرب لگا تا ہوں۔

حضرت گنگوہیؒ سے پوچھا گیا، حضرت نے فرمایا، بھائی! پڑھنے کا زمانہ تو گیا، قوی مضمحل ہو گئے، اس کے باوجود سوالا کھ اسم ذات کا معمول ہے۔ حالاں کہ باقی سارے کام یعنی حدیث کا درس، مہمانوں کی میزبانی، آنے والے سوالات اور فتاوی کے جوابات، خطوط کے جوابات اور نوافل وغیرہ کے دوسرے معمولات بھی سب اپنی جگہ باقی تھے، ان سب کے علاوہ چلتے پھرتے سوالا کھ بار اسم ذات کا ورد فرماتے تھے۔

ہم تو باقاعدہ کرنے بیٹھیں تو بھی شاید ہم سے سوالا کھ نہ ہو پائے۔ اللہ تعالی ان کے ان اعمال کی وجہ سے ان کے اوقات میں بھی برکت دیتے تھے۔

سوالا کھ اسم ذات کا معمول

حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانیؒ، دار العلوم دیوبند کے نائب مہتمم

تھے، بڑے مہتمم تو حضرت مولانا حافظ احمد صاحبؒ تھے؛ لیکن سارا انتظام یہی چلاتے تھے۔ ہمارے حضرت نے فرمایا کہ اس زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ سر پرست تھے، کوئی بات ہوتی تھی تو یہ دونوں حضرات گنگوہ جاتے تھے۔ وہاں پہنچ کر حضرت سے ملتے اور کوئی بات نہیں کرتے تھے، بلکہ اعتکاف فرما لیتے تھے۔ تین دن کے اعتکاف کے بعد جو معاملہ لے کر کے گئے ہوتے تھے، وہ پیش کرتے تھے۔ وہاں قیام کے دوران حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ، رات کو تہجد کے وقت چائے پکا کر حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چائے پکائی اور پیالی رکابی دھو کر اچھی طرح کپڑے سے خشک فرمائی، پھر چائے پیش کی۔ حضرتؒ نے فرمایا کچے پانی کی بو آ رہی ہے۔ دوسرے دن انہوں نے سکھا کر آگ پر تپایا اور پھر چائے پیش کی، تو فرمایا کہ آج نہیں ہے۔ اس پر ہمارے حضرت فرماتے تھے کہ اللہ کے ساتھ تعلق اور ذکر کی کثرت کے نتیجہ میں حواس بھی تیز ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ عشاء کی نماز کے لیے تشریف لائے، مغرب بعد کسی نے لالٹین جلانے کے لیے ماچس کی تلی جلائی ہوگی، تو حضرت نے فرمایا کہ بھائی ماچس کی تلی کی بو آ رہی ہے، حالاں کہ دو گھنٹے ہو گئے تھے، لیکن حضرت نے اس کا احساس فرمایا۔

ہمارے حضرت نے سنایا کہ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ مولوی حبیب الرحمن ! سب لوگ دعا کے لیے کہتے ہیں، اپنی بات پیش کرتے ہیں، آج تک تم نے کبھی کہا نہیں۔ تو کہا حضرت ! دلی تمنا یہ ہے کہ اس خدمت کا وہاں جنت میں موقع دیا

جائے۔تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ انشاء اللہ ضرور۔

مولانا حبیب الرحمنؒ کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ان کا بھی سوالاکھ اسم ذات کا معمول ذکر فرمایا ہے۔آپؒ اہتمام سنبھالتے تھے، اور اس میں طلبہ کی تربیت، نگرانی، وغیرہ کس قدر ذمہ داریاں ہوتی تھیں ان کی تفصیل آپ دارالعلوم کی تاریخ میں دیکھئے۔اہتمام ایسا کام ہے کہ آدمی کو کسی مصرف کا نہیں رہنے دیتا۔کھانے کے لیے بھی بچارے کو فرصت تلاش کرنی پڑتی ہے؛ لیکن دیکھئے، اس کے ساتھ یہ سب معمولات پورے ہو رہے ہیں۔

میں بھی کہوں، یہ کون حرم میں آ گیا؟

ہمارے اکابر کے یہاں ذکر اللہ کا کس قدر التزام تھا اس پر ہمارے حضرت نے حضرت سہارنپوریؒ کا ایک واقعہ سنایا تھا اور حضرت شیخ رحمۃ اللہ نے بھی فضائل ذکر (۳۵۰) میں اس کو تحریر کیا ہے کہ حضرت سہارنپوریؒ اپنے پانچویں حج کے موقع پر طوافِ قدوم کے لیے حرم شریف میں پہنچے۔

مولانا محب اللہ بہاری صاحبؒ، حضرت حاجی امداد اللہؒ کے خلیفہ اور بڑے صاحب کشف تھے، وہ اس زمانہ میں حرم شریف میں مقیم تھے۔

اس زمانے میں سعودی حرم بنا ہوا نہیں تھا، ترکی حرم میں نیچے مطاف کے کناروں پر چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے تھے، جو لوگ عبادت کے لیے حرم میں قیام کرتے تھے، حکومت کی طرف سے حجرے ان کے لیے تجویز کیے جاتے تھے، اس کو خلوہ کہتے تھے۔اور حضرت مولانا محب اللہ صاحبؒ بھی ایسے ایک

خلوے میں مقیم تھے۔

وہ اپنے خلوے میں بیٹھ کر دلائل الخیرات پڑھ رہے تھے اور حضرت مولانا مفتی ظفر احمد تھانوی نور اللہ مرقدہ وہاں ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ پڑھتے پڑھتے منہ اٹھا کر کہنے لگے ارے بھئی! یہ حرم میں کون آ گیا کہ سارا حرم روشن ہو گیا؟

ان کو معلوم نہیں کہ حضرت سہارنپوری حرم میں آئے ہیں، اور پھر حضرت سہارنپوری طواف سے فارغ ہونے کے بعد ان کے حجرے کے پاس آئے، ان کو سلام کیا تو ان کو دیکھ کر کہنے لگے کہ ''میں بھی تو کہوں، یہ کون حرم میں آ گیا کہ سارا حرم روشن ہو گیا''۔

سلام کر کے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب تو آگے بڑھ گئے۔

حضرت شیخؒ نے اس موقع پر مولانا ظفر احمد صاحبؒ کا حوالہ نہیں دیا ورا اتنا ہی واقعہ ذکر کیا ہے، لیکن میں نے اپنے حضرتؒ سے آگے کا واقعہ بھی سنا کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ ان کے جانے کے بعد حضرت مولانا محب اللہ صاحب نے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب سے فرمایا کہ مولوی ظفر احمد! ان کو پہچانتے ہو؟ مولانا ظفر احمد صاحب نے جواب میں عرض کیا کہ حضرت کیوں نہ پہچانوں؟ یہ تو میرے استاذ بھی ہیں اور میرے شیخ بھی ہیں۔ تو فرمایا کہ: نہیں پہچانا، نہیں پہچانا۔ یہ وہ شخص ہے کہ اگر حرم میں بیٹھ کر کعبۃ اللہ کی طرف نگاہ جما کر بیٹھ جائے تو ان کے چہرے پر اتنے انوارات کی بارش ہوتی ہے کہ میں دوپہر کے وقت سورج کی طرف نگاہیں جما کر دیکھ سکتا ہوں؛ لیکن ان کے چہرے کی طرف میں دیکھ نہیں

سکتا۔ آخر یہ انوار کس چیز کے تھے؟ یہ ذکر کے انوار تھے۔

ذکر اللہ کی مختلف شکلیں : تلاوت قرآن۔

ایک قرآن پاک کی تلاوت ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت میں بڑی تاثیر ہے۔ اللہ تعالی کا قرب تلاوتِ قرآن سے جتنا زیادہ حاصل ہوسکتا ہے کسی اور چیز سے نہیں۔ امام احمدؒ نے ایک بار اللہ تعالی کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا کہ باری تعالی! آپ کا قرب بندہ کس طرح سب سے زیادہ حاصل کرسکتا ہے؟ ارشاد ہوا کہ وہ چیز جو مجھ سے نکلی ہے، یعنی کتاب اللہ، قرآن؛ اس کی تلاوت سے۔ آپؒ نے پوچھا کہ سمجھ کر یا بے سمجھے؟ فرمایا سمجھ کر ہو یا بغیر سمجھے۔

فمی بشوق کا معمول

بہر حال قرآن کی تلاوت کا معمول ہونا چاہیے۔ میں نے جیسا کہ درمیان میں عرض کیا تھا، ہر ایک اپنے گریبان میں جھانک لے، اپنا اندازہ کرلے، جائزہ لے لے کہ میں روزانہ قرآن پاک کی کتنی تلاوت کرتا ہوں؟ حضرات صحابہ کا خاص طور پر قراء صحابہؓ کا، معمول کم سے کم فمی بشوق یعنی ہر روز ایک منزل کا تھا۔

حضرت معاذؓ اور حضرت ابوموسی اشعریؓ کا

پیمانِ دوستی اور تلاوت کا معمول

حضرت معاذؓ اور حضرت ابوموسی اشعریؓ کا قصہ بخاری شریف میں مروی

ہے کہ حضور ﷺ نے ان حضرات کو جب یمن کے دو الگ الگ علاقوں کا حاکم بنا کر بھیجا تو ان کو کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں، اور یہ حضرات وہاں جانے کے بعد اپنے علاقے کا جب دورہ کرتے تھے، اور دوسرے کی قیام گاہ قریب آتی تھی تو ان سے ملاقات کر لیتے تھے، تا کہ دوستی کا عہد و پیمان تازہ ہو جائے۔

دوستی اور تعلق بھی پانی چاہتا ہے۔ اس کا پانی کیا ہے؟ آپس میں ملاقات۔ اگر ملاقات کرنا چھوڑ دیں گے تو وہ ختم ہو جائے گی۔ شریعت یہ کہتی ہے کہ یا تو زیادہ تعلق قائم مت کرو اور اگر کسی سے قائم کیا ہے تو اس کو نبھانے کا اہتمام کرو۔

یہ دونوں حضرات اس کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنے علاقے کے دورے پر نکلے۔ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کا علاقہ قریب آیا تو دوستی کا عہد و پیمان تازہ کرنے ان کے پاس پہنچے۔ دیکھا کہ لوگوں کا مجمع ہے، ایک آدمی پیچھے کی طرف ہاتھ باندھ کر کے قید کر کے لایا گیا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا یہ یہودی تھا، مسلمان ہوا تھا، پھر مرتد ہو گیا۔ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کہ مرتد کی سزا تو **من بدل دينه فاقتلوه** ہے۔ اس کو قتل کرو۔ اس کے بغیر میں سواری سے اتروں گا نہیں۔ ان حضرات کے یہاں شریعت کے حکم پر عمل کرنے کا یہ اہتمام تھا۔

حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، آپ اتریے تو سہی۔ یہ ضرور ہوگا۔ اسی لیے تو لایا گیا ہے، فرمایا نہیں، جب تک یہ نہیں ہوگا اتروں گا نہیں۔ چنانچہ جب تک یہ سزا جاری نہیں کی گئی، وہ اپنی سواری سے نہیں اترے۔ اس کے بعد جب اترے اور آپس میں گفتگو ہوئی تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں کہ

آپ کا قرآن پاک کی تلاوت کا کیا معمول ہے؟ کیوں کہ دونوں قراء صحابہ میں سے تھے۔

فرمایا: أنا أتفوقه تفوقا، میں تو تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتا ہوں، رات اور دن میں، چوبیس گھنٹے میں اپنا ایک منزل کا معمول پورا کرتا ہوں۔

فواق الناقۃ

یہ لفظ 'فواق الناقۃ' سے ہے، اونٹنی کو جب دوہا جاتا ہے تو دوہنے کے درمیان دو مرتبہ اس کے پستان اور آنچل پر پمپنگ ہوتا ہے۔ ایک بار دبانے والے نے دبایا تو جو دودھ اندر تھا وہ نکل گیا، اب اگر دبائے رہے گا تو دوسرا دودھ آنے والا نہیں، اس لیے چھوڑنا پڑے گا۔ دوسرا دودھ آئے پھر دبائے گا تو دودھ نکلے گا۔ اس طرح دودھ دوہا جاتا ہے۔ یہ جو ایک مرتبہ دبانے اور دودھ نکلنے کے بعد پستان کو چھوڑ دیا جاتا ہے اس وقفہ کو 'فواق' کہتے ہیں، یعنی بہت قلیل وقفہ۔ حدیث میں آتا ہے **العیادۃ فواق ناقۃ**، کسی کی عیادت کے لیے جاؤ تو بہت مختصر وقت کے لیے جاؤ، دیر تک بیٹھو مت، کسی بھی چیز کے اختصار اور شورٹ ہونے کو تعبیر کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

پھر حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ کس طرح کرتے ہیں؟ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں رات کے شروع حصے میں کچھ سو لیتا ہوں، اور پھر اٹھ کر کے نماز اور قیام اللیل میں قرآن کی تلاوت کا اپنا معمول پورا کرتا ہوں اور پھر ایک جملہ فرمایا کہ **وأنا أحتسب نومتی کما أحتسب**

قومتی، (بخاری شریف، کتاب المغازی، ۴۰۸۶) میں جس طرح اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے وقت اللہ سے اس بات کی توقع اور امید رکھتا ہوں کہ اس پر مجھے ثواب ملے گا، اسی طرح سونے میں بھی اللہ سے ثواب کی امید رکھتا ہوں، یہ جملہ بڑا قابل غور ہے۔

احتساب اور امیدِ ثواب۔

کون مسلمان ہے جو نماز پڑھے اور اس کے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ اس پر ثواب ملے گا، ہر آدمی عبادت اسی لیے کرتا ہے؛ مگر سوتے وقت کبھی کسی کو یہ خیال نہیں آتا اور کوئی نہیں سوچتا کہ اس سونے پر بھی اللہ مجھے ثواب دیں گے۔ لیکن حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں سوتے وقت بھی اللہ تعالی سے ثواب کی امید کرتا ہوں۔

امور طبعیہ یعنی طبعی ضرورتوں کو پوار کرنے کے دوران بھی اگر آدمی اپنی نیت ٹھیک کرلے تو یہ نیت کی درستگی ان طبعی ضرورتوں کو بھی عبادت بنا دیتی ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی (ص:۷۸) میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ، رئیس الاحرار کا واقعہ ذکر فرمایا ہے۔ اس میں حضرت مولانا حبیب الرحمنؒ کے سوال کا ذکر ہے کہ تصوف کیا ہے؟ تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر سا جواب دیا تھا کہ تصحیح نیت، یعنی آدمی ہر کام میں اپنی نیت ٹھیک کرلے۔ بس یوں سمجھو کہ پھر ہر چیز عبادت ہے، اور خدانخواستہ نیت خراب ہو گئی تو عبادتیں بھی عبادت نہیں رہتی، وبال بن جاتی ہیں۔

آج کے اہل علم کا تلاوت کا معمول کیا ہے؟

یہ تو حضرات صحابہؓ کی تلاوت کا معمول تھا۔ ہمارے اکابر کی تلاوت کا معمول دیکھئے۔

تمام اکابرین کے یہاں تلاوت کے، ذکر کے، معمولات کی ادائیگی کے اوقات متعین ہوتے تھے اور اس کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔

میں اگلے سفر میں جب یہاں آیا تھا اور یہاں سے زامبیا جانا ہوا تھا، تو حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب متالا رحمہ اللہ سے (اللہ تعالی ان کی قبر کو نور سے بھر دے) میں نے خاص طور پر دریافت کیا کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ کی تلاوت کا معمول کیا تھا؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ تقریباً آٹھ نو پارے روزانہ پڑھ لیا کرتے تھے، نوافل وغیرہ کے ساتھ۔ حضرت کی علمی مشغولی سب اہل علم جانتے ہیں، انہیں فرصت نہ تھی؛ پھر بھی نوافل اور تلاوت کا اس قدر اہتمام تھا۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑئے عالم سے، جو حدیث پڑھاتا ہو، فقہ پڑھاتا ہو، علیا کی کتابیں پڑھاتا ہو، اس سے پوچھئے کہ آپ روزانہ کتنی تلاوت کرتے ہیں؟ پاؤ پارہ یا آدھا پارہ بھی نہیں۔

کہتے ہیں کہ مولوی صاحب! فرصت نہیں ملتی، کتاب پڑھاتے ہیں، مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے وقت نہیں ملتا۔ ہمارے پاس وقت نہیں اور ہمارے ان اکابرین کے پاس بہت کچھ وقت تھا۔ پورا دورہ پڑھاتے تھے پھر بھی وقت تھا۔ کیا ہم نے یہ سب اذکار جاہلوں کے لیے چھوڑ رکھے ہیں۔

تذکرۃ الخلیل میں، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ کیسا ہی مشکل سے مشکل سفر ہو، بیماری ہو اور کیسے بھی حالات ہو، لیکن آپ کے معمولات، آپ جن اعمال کو انجام دیتے تھے، اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ظہر کے بعد دروازہ بند ہوجاتا تھا اور کسی کو ملاقات کی اجازت نہ تھی۔

ہم تو اپنے آرام کے وقت کسی سے ملاقات نہیں کرتے ہیں، اور معمولات کے وقت اگر کوئی آ گیا تو ماشاء اللہ، معمولات کو قربان کر دیں گے۔ ایسا طریقہ نہیں ہونا چاہیے۔

پنج وقتہ نماز کے بھی لالے

بلکہ آج تو پنج وقتہ نماز کے لالے پڑ رہے ہیں، باجماعت نماز تو دور رہی؟

لوگ ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ فلاں جگہ مکتب میں پڑھانے والے مدرس نماز میں حاضر نہیں ہوتے۔

بیرون ممالک میں بھی یہ شکایت کرتے ہیں۔ وہاں ایسا نظام ہوتا ہے کہ ایک مکتب میں پانچ دس مدرس پڑھاتے ہیں تو مسجد کی امامت کے لیے سب کی باریاں مقرر ہوتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ جب باری ہوتی ہے تب تو فجر میں مولوی صاحب آتے ہیں، باری نہیں ہوتی تو نہیں آتے، چنانچہ جن کی باری ہے خدانخواستہ اگر وہ غیر حاضر ہے تو کوئی ایک بھی امام مسجد میں موجود نہیں۔

ہمارے یہاں بھی لوگ شکایت کرتے ہیں کہ علماء فجر کی نماز میں غیر حاضر

ہوتے ہیں۔ ان چیزوں کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، میں -نعوذ باللہ- آپ کی، تذلیل یا تنقیص کے لیے نہیں، ایک دردِ دل کے طور پر یہ کہہ رہا ہوں کہ آج یہ وقت آ گیا کہ لوگ ہمارے متعلق ایسی شکایت کرتے ہیں! ایک زمانہ وہ تھا کہ اعمال کے باب میں اہل علم کا مقام اتنا اونچا ہوا کرتا تھا کہ کوئی اس کا تصور نہیں کرسکتا

امام ابوحنیفہ نے امام ابو یوسفؒ کو- جو آپ کے شاگردوں میں اولین مقام کے حامل ہیں- جو نصیحتیں فرمائیں وہ الاشباہ والنظائر میں موجود ہیں، ان میں ایک نصیحت یہ بھی ہے کہ اپنے اعمال، عبادات وغیرہ کا ایسا اہتمام ہو کہ اس کی وجہ سے جاہلوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مجھے اپنی جہالت نے جتنا فائدہ پہنچایا اس عالم کو اس کے علم نے اتنا بھی فائدہ نہیں دیا۔

غیر عالم جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، صف اول کا اہتمام کرتا ہے، تکبیر اولی کا اہتمام کرتا ہے، تلاوت کا اہتمام کرتا ہے، تسبیحات کا اہتمام کرتا ہے، غیر مشروع چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرتا ہے اور اہل علم اس باب میں غفلت کا شکار ہیں، ظاہر ہے اس صورت میں چوراہوں پر لوگ یہی باتیں کریں گے کہ یہ مولوی کیسے؟ ان کو ان کے علم نے وہ فائدہ نہیں پہنچایا جو ہم کو ہماری جہالت نے پہنچایا، وہی جملہ جو امام ابوحنیفہؒ نے امام ابو یوسف سے فرمایا۔

یکے از قوم بے دانشی کرد --- نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

شیخ سعدی کہہ گئے ہیں کہ کسی جماعت کا ایک فرد اگر کوئی غلط کام کر لیتا ہے تو اس کی وجہ سے پوری جماعت کی عزت اور آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے، ایسا کرنے والے سب نہیں، چند گنے چنے ہوتے ہیں؛ لیکن ان کی وجہ سے پوری

جماعت پر اعتراض ہوتا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایسا بنائیں، ہماری جماعتِ اہل علم کا لوگوں کے قلوب میں اتنا وقار اور عظمت ہو کہ کوئی بات وہ کہہ دے تو وہ پتھر کی لکیر بن جائے، لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے ٹوٹ پڑیں، آج تو ہم کہتے رہتے ہیں کوئی دھیان بھی نہیں دیتا، کیوں کہ ہمارے قلوب میں وہ کیفیت نہیں رہی اور ہماری تاثیر ختم ہوگئی۔

ذکر کی دوسری قسم

دوسری قسم صبح شام کی تسبیحات ہیں۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں و سبحوہ بکرۃ و أصیلا۔ یعنی اللہ تعالی صبح و شام کے مخصوص اوقات میں ذکر اللہ کی تاکید فرما رہے ہیں۔

تیسری قسم ہے: ذکر جہری

اس کے بعد نمبر ہے اس ذکر جہری کا، جو ہمارے اکابر بتاتے ہیں۔ یہ بڑی اہمیت بایں معنی رکھتا ہے کہ ہمارے قلب پر غفلت کے پردے آجانے کی وجہ سے عبادتوں کا صحیح فائدہ اور اس کا جو صحیح ثمرہ مرتب ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ذکر جہری کو ایک علاج اور دوا کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قلب کی صفائی ہوتی ہے اور پھر یہ تلاوت، دعائیں، تسبیحات وغیرہ کے اصلی اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اہل علم کے لیے لازم ہے کہ ذکر اللہ کا، تلاوت کا اور رات

کے قیام کا اہتمام فرمائیں۔ یہ سب بہت ضروری ہے، جب تک اس کا اہتمام نہ ہوگا، ہمارے ان اعمال میں جان پڑنے والی نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم اپنے اکابر کی طرف نسبت کو اپنے لیے فخر سمجھتے ہیں اور اُن کاموں کو لے کر چل رہے ہیں جو ان حضرات نے شروع کیے تھے، اور اسی میں اپنی سعادت سمجھتے ہیں؛ لیکن ان سب کے ساتھ ہونی چاہیے ایسی دو اہم چیزوں کی طرف ہماری بے توجہی اور غفلت بڑھ رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا اہتمام کیا جائے۔ انشاء اللہ اس کے نتیجہ میں ہم میں جو کمی ہے وہ دور ہو جائے گی۔

اخیر میں دو واقعے بیان کر کے اپنی بات پوری کرتا ہوں۔

بے ادب ہوگئی محفل ترے اٹھ جانے سے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے اہل علم کے سامنے کی تھی، اس میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ حیدر آباد میں ایک بزرگ تھے، ایک مرتبہ ان کے گھٹنوں میں درد ہوا۔

وہ اسی حال میں مجلس میں تشریف فرما تھے۔ مجلس میں سب مریدین اور معتقدین بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے اپنے خادم سے دوا ملنے کو کہا، خادم نے دوا ملنا شروع کی تو اس نے دیکھا کہ بزرگ صاحب مجلس میں خاموش ہیں، مگر مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں کانا پھوسی کر رہے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہیں، جیسا کہ ہمارے طلبہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کانا پھوسی کی وجہ سے ایک گونج سی مجلس میں پیدا ہو رہی ہے۔

اس خادم نے سوچا کہ حضرت کی مجلس کا یہ حال کبھی نہیں ہوا، ان کی مجلس میں جب بھی لوگوں کو دیکھا خاموش دیکھا، لیکن آج یہ کیا بات ہے؟ کانا پھونسی کیوں ہو رہی ہے؟ وہ بار بار بے چین ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہے، مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے، وہ بزرگ اس انتشار کو بھی سمجھ گئے تھے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے، اور خادم کی پریشانی بھی بھانپ گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے گھٹنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس طرح وہ خادم کو اس انتشار کی وجہ بتلانا چاہتے تھے، لیکن خادم یوں سمجھا کہ یہاں درد ہے، اس لیے وہ اور دبانے لگا۔ مجلس میں شور کی کیفیت ابھی بھی ختم نہ ہوئی تھی، اور وہ بے چین ادھر اُدھر دیکھے جا رہا ہے۔ آخرش ان بزرگ نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر کہا کہ میں گھٹنے کے اس درد کی وجہ سے آج رات کے معمولات پورے ادا نہیں کر سکا ہوں، اس کا یہ اثر ہے جو تم مجلس میں دیکھ رہے ہو۔

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے ایک شعر پڑھا۔

رحم کر قوم کی حالت پر اے ذکرِ خدا
کہ بے ادب ہوگئی ہے محفل ترے اٹھ جانے سے

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک اللہ والے کے اپنے معمولات چھوڑنے کا نتیجہ مجلس پر یہ ہو سکتا ہے تو تمام اہل علم اپنے معمولات چھوڑ دیں گے تو دنیا پر کیا اثر مرتب ہوگا؟ آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اہل علم کی جانب سے یہ بڑی غفلت ہے، اور اس کے اثرات آدمی کے ماتحت لوگوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ ہوا۔

مولانا علی میاںؒ اور شیخ علی الدقر کے وعظ میں تاثیر

دوسرا واقعہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی عربی سوانح 'أبو الحسن الندوی ، الإمام المفکر الداعیة المربی الأدیب' کا ہے، جو سید عبد الماجد غوری صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔

دار ابن کثیر، بیروت، ہر سال کسی بڑے آدمی کی سوانح کو شائع کرتا ہے، جس سال یہ سوانح لکھی گئی، اس نے اس کو شائع کیا۔ اس کا مقدمہ دمشق یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے ہیڈ، ڈاکٹر مصطفی سعید الخن کا لکھا ہوا ہے، اس مقدمے میں انہوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ۱۹۵۶ میں شام کی حکومت نے دمشق یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر، الاستاذ الزائر، کے طور پر **رجال الدعوة والفکر** کے عنوان پر محاضرات پیش کرنے کے لیے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو دعوت دی۔ وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔ زیادہ معمر نہیں تھے۔ جب وہ دمشق تشریف لائے تو ان کے قیام کے لیے حکومت نے فائیو اسٹار ہوٹل میں انتظام کیا۔

مولانا نے کہا کہ میں تو ایک مولوی آدمی ہوں، فائیو اسٹار ہوٹل میں میرا جی نہیں لگے گا، مسجد کے کسی حجرے میں میرے لیے انتظام کر دو، وہیں مجھے سکون رہے گا۔ چنانچہ ان کے اصرار پر منطقہ حلبونی کی ایک مسجد میں اس کا نظم کر دیا گیا۔

یہ عربی محاضرات ہی بعد میں مولاناؒ کی کتاب 'تاریخ دعوت وعزیمت' کا خاکہ اور بنیاد بنے تھے۔ اسی مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ جو

رجوع عطا فرمایا اس کی وجہ صرف رجوع وانابت الی اللہ ہے۔

مقدمہ میں اسی مناسبت سے انہوں نے ایک اور واقعہ ذکر کیا ہے کہ دمشق میں ایک عالم تھے، شیخ علی الدِّقر۔ (متوفی: ۱۳۶۲ھ۔) ایک مسجد میں امامت کراتے تھے اور فجر کی نماز کے بعد قرآن کا درس دیتے تھے، ان کے قرآن کے درس میں شرکت کرنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے تھے، میں اس وقت چھوٹا ہونے کے باوجود صرف درس سننے کے لیے بڑی دور سے آ کر درس میں شریک ہوتا تھا۔ چھوٹی سی مسجد بھر جاتی تھی، جگہ تنگ ہوتی تھی تو باہر سڑک پر چٹائیاں بچھا کر لوگ بیٹھتے تھے اور تاثیر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے اور ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوتی تھیں؛ حالاں کہ بعض مرتبہ دور تک آواز بھی نہیں پہنچتی تھی۔ یہ کیفیت دیکھ کر ان کے ایک شاگرد نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا، حضرت! آپ بھی قرآن کا درس دیتے ہیں، ہم بھی قرآن کا درس دیتے ہیں، ہم اپنے درس میں عجیب وغریب نکات بیان کرتے ہیں، اور آپ ایسے نکات اپنے درس میں بیان نہیں کرتے، اس کے باوجود ہمارے درس میں وہ تاثیر نہیں جو آپ کے درس میں نظر آتی ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا، بیٹا! تمہاری تربیت کے لیے کہتا ہوں کہ میں روزانہ رات کو تہجد کی نماز میں قرآن پاک کے دس پارے اسی لیے تلاوت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس درس میں تاثیر ڈالے، اس کا یہ اثر ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ان کاموں میں اسی سے جان پڑے گی۔
اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس کا اہتمام ہو، اس کی طرف توجہ ہو۔

طلبہ سے بھی کہوں گا کہ ابھی سے وہ قیام اللیل کی عادت ڈالیں۔ اہل علم کو بھی چاہیے کہ اس کی طرف توجہ کریں۔ ذکراللہ کی جو مختلف شکلیں ہیں اور روزمرہ مختلف کاموں کے جواذکار ہیں اس کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ **كان يذكر الله على كل أحيانه**، ہروقت اللہ کے ذکر میں آپ مشغول رہتے تھے۔

بہرحال ذکر اللہ کی جو مختلف شکلیں ہیں، ان تمام کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالی مجھے اورآپ سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔ میں کہنے والا بھی اس کا محتاج ہوں۔

اللہ ہم سب کواس طرف متوجہ فرمائے۔

2013-06-09 - EspingoBeach

2013-08-19 Darul Uloom Blackburn

2013-05-02 Bayan In Ulama-Jamia Sidokar-Veraval

آداب المعلمین

نبی کریم ﷺ نے دین کے معاملے میں جن حکمتوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھا، اور جن کی طرف حضرات صحابۂ کرامؓ کی رہنمائی فرمائی، ان حکمتوں اور مصلحتوں میں سب سے بڑی اور بنیادی حکمت ومصلحت یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں آدمی کو ایسا انداز، ایسا طریقہ اور ایسی روش اختیار کرنی چاہیے، جس کے نتیجے میں لوگ دین سے دور نہ ہوں بلکہ قریب ہوں۔ ان میں نفرت پیدا نہ ہو بلکہ انسیت پیدا ہو۔

اَلْحَمْدُ للہ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُباللہ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَ مِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہ ، صَلَّی اللّٰہ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ امابعد۔

فأَعُوذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِك.(آل عمران: ۱۵۹)

وقال تعالی : لَقَدْ جَاءَکُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِکُمْ عَزِیزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیصٌ عَلَیْکُم بِالْمُؤْمِنِینَ رَءُوفٌ رَّحِیمٌ (توبۃ: ۱۲۸)

وقال النبی ﷺ: انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین ۔(بخاری ، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول: ۲۱۷)

بہترین مشغلہ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا احسان اور کرم ہے کہ اس نے ہم لوگوں کو ایک ایسی خدمت اور ذمہ داری میں لگا رکھا ہے، جو دنیا میں انجام دی جانے والی تمام ذمہ داریوں اور خدماتمیں سب سے افضل ہے ۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک سیکھیں اور سکھائیں ۔شراح نے لکھا ہے کہ یہ خطاب براہِ راست نبی کریم ﷺ کا

حضرات صحابہ کرامؓ سے تھا اور اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے کہ حضراتِ صحابہ کی جماعت وہ جماعت ہے جو انبیاء کرام کے بعد انسانوں میں سب سے افضل جماعت ہے، اور ان میں بھی سب سے بہتر وہ ہیں جو قرآن پاک سیکھیں اور سکھلائیں۔ قرآن پاک سیکھنے اور سکھانے کا یہ مشغلہ، چاہے اس کے الفاظ ہوں، معانی ہوں یا اس سے نکلنے والے مسائل ہوں؛ یہ وہ بہترین مشغلہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی کام دنیا میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا بڑا احسان اور فضل ہے کہ اس نے ہمیں ایک ایسے کام میں لگا رکھا ہے جس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے خیریت کی اور اس کے سب سے بہتر ہونے کی بشارت سنائی ہے۔

ہماری ذمہ داری

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چوں کہ یہ فضیلت اور یہ مقام ہمیں عطا فرمایا ہے اس لیے ہمیں سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے، ہم تو اس لائق نہیں تھے کہ یہ خدمت ہم سے لی جاتی، مگر تیرا احسان اور فضل ہے کہ ہماری نالائقیوں اور ہماری کمزوریوں کے باوجود تو نے اس خدمت کے لئے ہم کو منتخب کیا۔

ساتھ ہی ساتھ اس منصب کے مناسبِ حال جو اوصاف، طریقے اور انداز ہیں وہ اختیار کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے کہ یہ دین کا کام ہے اور سب سے افضل کام ہے۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت ہی دین کو لوگوں تک پہنچانے کیلئے ہوئی تھی، اور حضراتِ علماء کرام انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، اور وراثت کا

مطلب یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دین پہنچانے کا جو کام کرتے تھے، اب انبیاء کے بعد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ ذمہ دار یحضرات ِعلماء کرام کے سروں پر ہے۔

کام اور طریقہ، دونوں حضور کے

حضورا کرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کولوگوں تک پہنچانے کے معاملہ میں جن حکمتوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھا اور دین پہنچانے کیلئے لوگوں کے مزاج اور ان کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے جو طریقۂ کار اختیار کیا، اُسی طریقۂ کار، انہی حکمتوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھ کر ہمیں کام کرنا ہے، تب ہی حقیقی معنیٰ میں ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور آپ کے وارث قرار دئے جائیں گے۔ اور اگر کام تو ہم ہاتھ پر وہ لیں، اور اس کے لئے طریقہ، انداز اور مصلحت وحکمت وہ اختیار نہ کریں جو نبی کر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار کی تھی؛ تو یہ کام جیسا انجام دینا چاہیے، اس طرح ادا نہیں ہوگا؛ بلکہ اس صورت میں ہماری غلط پالیسی اور غلط حکمت ِعملی کی وجہ سے، یا اس طریقہ سے ہٹنے کی وجہ سے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو بتلایا تھا؛ ہم دین کے لئے بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر اور نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

دین سے قریب لائیں، دور نہ کریں۔

اس وقت میں زیادہ تفصیل نہیں کروں گا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کے معاملے میں جن حکمتوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھا، اور جن کی طرف حضرات صحابۂ

کرامؓ کی رہنمائی فرمائی، ان حکمتوں اور مصلحتوں میں سب سے بڑی اور بنیادی حکمت ومصلحت یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں آدمی کو ایسا انداز، ایسا طریقہ اور ایسی روش اختیار کرنی چاہیے، جس کے نتیجے میں لوگ دین سے دور نہ ہوں بلکہ قریب ہوں۔ ان میں نفرت پیدا نہ ہو بلکہ انسیت پیدا ہو۔ گویا ہم دین کے خدام کا عمل لوگوں کو دین سے قریب لانے کا ذریعہ بنے، دور لے جانے کا ذریعہ نہ بنے۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی پوری حیات طیبہ میں اسی حکمت پر عمل کیا، اور حضرات صحابۂ کرامؓ کو بھی اس کی طرف رہنمائی کرتے رہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ لوگوں کا جو معاملہ رہتا تھا وہ غلط اور ناروا ہوتا تو بھی ان کے غلط یا سخت سے سخت رویہ اور انداز کے جواب میں کبھی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا، جو ان کو دین سے دور کرنے والا ہو۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے ساتھ اختیار کئے جانے والے انداز کو دیکھ کر دوسروں کو بھی دین سے دوری ہو، اس کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوارا نہیں کیا۔

انصار اور مہاجرین کی گروہ بندی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت میں ایک مستقل جماعت بنائی تھی، اور آپ جانتے ہیں کہ کفر کی جو مختلف قسمیں ہیں، ان میں سب سے خطرناک قسم نفاق ہے اور اس پر بڑی بڑی وعیدیں ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إن المنافقین فی الدرک الأسفل من

النار ،جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں منافقین کے ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔عبداللہ بن ابی ان منافقین کا سب سے بڑا سردار تھا۔ بہت سے مواقع پر اس کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہایت ہی برا معاملہ کیا گیا۔

چناں چہ ایک موقع پر،غزوۂ مریسیع (بنو المصطلق) سے واپسی میں ایک انصاری اور ایک مہاجری صحابی کے درمیان جھگڑا ہوگیا، ایک جگہ لشکر قیام پذیر تھا، جہاں ٹھہرنے کا فیصلہ ہوا، وہاں پانی کی بڑی قلت تھی، چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں تھوڑا سا پانی تھا۔لشکر کے جو لوگ پہلے پہنچے، انھوں نے اس پر قبضہ کرلیا، کسی نے اپنی ڈھال رکھ دی، کسی نے اپنی کوئی اور چیز رکھ دی۔ جیسے کہ عام طور پر ایسے مواقع میں اپنا حق جتلانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔خیر! ایک مہاجری جو حضرت عمرؓ کے اجیر اور خادم تھے، انہوں نے ایک گڑھے پر اپنا چمڑا ڈال دیا جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔اس پانی کو پلانے کے لئے ایک انصاری آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ میں نہیں پلانے دوں گا، یہ میرا ہے۔اسی میں دونوں میں تیز گفتگو ہوگئی اور اس مہاجری نے انصاری کو کمر پر ایک چپت ماردی۔

اس پر اس انصاری نے کہا: **یاللأنصار** اے انصار! میری مدد کے لئے آؤ۔

اُدھر مہاجری نے کہا: **یاللمهاجرین** اے مہاجرین! میری مدد کے لئے آؤ۔

چنانچہ کچھ لوگ ادھر سے اور کچھ لوگ اُدھر سے جمع ہو گئے۔

جماعتی تعصب جاہلیت کا نعرہ ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گوش مبارک میں یہ آواز پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ یہ

کیا ہے؟ **مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ ؟** یہ جاہلیت کا نعرہ میں کہاں سے سن رہا ہوں؟ یعنی اپنی جماعت، اور اپنی کمیونٹی کو اپنی مدد کے لئے دعوت دینا، یہ تو جاہلیت کا نعرہ ہے۔ پھر اس معاملہ میں کچھ بڑے لوگ بیچ میں پڑے اور معاملہ نمٹ گیا۔

اس غزوہ میں عبداللہ بن ابی بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شریک تھا، کیوں کہ اس غزوہ میں امید تھی کہ کچھ مالِ غنیمت ملے گا۔ اس کو بھی پتہ چل گیا کہ یہ قصہ ہوا ہے۔

ادھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ انصار ہی وہ لوگ تھے جنہوں نے مہاجرین کی پوری مدد کی۔ اب تک مہاجرین ان کے گھروں میں ہی رہ رہے تھے، ابھی تک اپنے الگ گھر بھی نہیں بسائے تھے اور انہیں کے یہاں کھاتے پیتے تھے۔

ایسے سفر میں لوگ جب کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے ہیں تو اس دوران مختلف مقامات پر الگ الگ لوگوں کا قیام رہتا ہے، لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر باتیں کرتے اور مجلسیں جماتے ہیں۔ عبداللہ بن ابی بھی اپنی جماعت کے لوگوں کو جمع کئے ہوئے اور مجلس جمائے ہوئے تھا، اس میں اس نے یوں کہا کہ دیکھو! ہم نے ان (مہاجروں) کو کھلایا پلایا، اب یہ لوگ ہمارے سر پر سوار ہو رہے ہیں، ابھی آگے آگے دیکھو، کیا ہوتا ہے۔ میں تو پہلے سے کہتا تھا، اب بھی سمجھ جاؤ، اب بھی اگر ان کو کھلانا پلانا چھوڑ دو گے، اور ان کی مدد نہیں کرو گے؛ تو آپ ہی آپ یہ سب بھاگ جائیں گے، وہ تو اس لئے پڑے ہوئے ہیں کہ تم ان کو کھلا پلا رہے ہو۔ پھر اس نے کہا کہ، ان کو مدینہ پہنچنے دو، جو عزت والے ہیں وہ ذلیلوں کو نکال دیں گے۔ (بخاری: ۴۹۰۵ / مسلم شریف: ۶۷۴۸) عزت والے بول کر اس کا اشارہ اپنی

طرف تھا، اور ذلیل بول کر (نعوذ باللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی طرف تھا۔

منافق سردار اور کم سن صحابی کی قسم

وہ یوں سمجھتا تھا کہ اس وقت میرے سامنے جو لوگ ہیں وہ سب میرے ہم خیال ہیں، اور حقیقت بھی یہی تھی، وہ سب اسی کی پارٹی اور ٹولی کے لوگ تھے، اسی میں بیٹھ کر یہ اپنا اظہار خیال کر رہا تھا؛ لیکن اتفاق کی بات کہ ایک چھوٹے سے مخلص صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ اس کا خیال ان کی طرف نہیں گیا یا بچہ سمجھ کر دھیان نہیں دیا ہوگا۔ جب اس نے یہ بات کہی تو وہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ تم ایسا کہتے ہو، میں جا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہہ دیتا ہوں۔ اب اس کو احساس ہوا کہ یہ تو سب معاملہ گڑبڑ ہو گیا اور اندر کی بات باہر چلی جائے گی۔

ادھر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اپنے چچا کے پاس آئے اور ساری تفصیل بتائی، لیکن کوئی بچہ کسی بڑے کے متعلق کوئی نامناسب بات کہے تو لوگ اس کی بات فوراً مان نہیں لیتے، پہلے تو اسی کو برابر ڈانٹا جاتا ہے کہ سوچ کر بول! کیا کہتا ہے؟ کس کے متعلق کہتا ہے؟ بڑے آدمی کے متعلق ایسی بات کرتا ہے؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ تم کس کے متعلق کہہ رہے ہو، اتنا بڑا آدمی ہے، قوم کا سردار ہے۔ عبد اللہ بن ابی معمولی آدمی نہیں ہے، اس کے متعلق تم ایسی بات کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے برابر سنا ہے۔

خیر! ان کے چچا نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بات پہنچائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبد اللہ کو

بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا کہا ہے؟ اس نے قسم کھا کر کہہ دیا کہ میں نے ایسا کہا ہی نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ بڑا آدمی بچہ کے مقابلہ میں قسم کھائے، اور بچہ بھی قسم کھائے تو اس کی کون مانے گا؟ اب اپنے پرائے سب لوگ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کو ڈانٹ رہے اور کوس رہے ہیں کہ تم نے یہ کیا کیا؟ حضرت زید بن ارقمؓ کہتے ہیں کہ میرے لئے تو منہ چھپانا مشکل ہو گیا؛ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت زید بن ارقمؓ کی براءت کے لئے سورۂ منافقون نازل فرمائی۔

منافق کے قتل کی اجازت نہ دی۔

جب یہ سورۂ منافقون نازل ہوئی اور یہ بات صاف ہو گئی کہ وہ ایسا بولا تھا تو حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ اے اللہ کے رسول، آپ اجازت دیجئے میں اس کی گردن اڑا دوں۔

منافقین کا یہ سرادر اپنی ایسی حرکتوں کی وجہ سے اس لائق تھا کہ اس کی گردن اڑوا دی جاتی، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرماتے ہوئے اجازت نہیں دی کہ لوگ یوں کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو مروا دیتے ہیں (بخاری: ۴۹۰۵ /سنن الترمذی: ۳۳۱۵)۔ یعنی تم لوگ ہمارے سامنے ہو اور حقیقت حال سے واقف ہو کہ میں اگر اس کے مارنے کا حکم دے دوں تو وہ بالکل صحیح و درست ہے اور وہ اس لائق ہے۔ لیکن یہ بات یہاں تک تو محدود نہیں رہے گی، بلکہ دنیا میں پھیلے گی اور جب باہر جائے گی تو لوگ یوں کہیں گے کہ ایک آدمی جو ابھی ابھی اسلام لایا تھا (ظاہر میں تو وہ مسلمان تھا، کلمہ پڑھتا تھا) اس کو بھی انہوں نے قتل کروا ڈالا۔ تو محض

اس لئے کہ یہ چیز لوگوں کے اسلام سے قریب آنے کے بجائے دور ہونے کا ذریعہ بنے گی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے کے بجائے اس سے انکار کرنے کا ذریعہ بنے گی، آپ نے اجازت نہیں دی۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت داری پر انگلی اٹھانا

اس کے علاوہ اور بھی واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا کہ انصاف سے تقسیم کیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے بندے! میں تو اللہ کا رسول ہوں، اگر میں انصاف نہیں کروں گا تو دنیا میں کون کرے گا؟ اور جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے اوپر اعتماد اور بھروسہ کیا، مجھ پر وحی بھیجی اور اپنی وحی لوگوں تک پہنچانے کے لئے مجھے امانت دار مانا؛ تو تم مجھے مال کے معاملہ میں امانت دار نہیں سمجھتے؟

اس موقع پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ اور یہ معاملہ تھا بھی ایسا ہی، کیونکہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے، اس کا تو ایمان ہی نہیں رہتا، لیکن وہاں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت نہیں دی۔ اسی وجہ سے کہ لوگ یوں کہیں گے کہ محمد نے اپنے آدمی کو قتل کروا دیا۔ اور پھر یہ چیز لوگوں کو دین سے دور کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبداللہ بن ابی کے قتل کا فیصلہ فرماتے، یا اس

آدمی کے قتل کی حضرت خالد بن ولیدؓ کو اجازت دیتے؛ تو صحیح اور برحق تھا اور وہ اس کے حق دار تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن آپ ﷺ نے اسی بصیرت کے پیش نظر اس کی اجازت نہ دی کہ یہ اقدام لوگوں کو اسلام سے دور رکھنے کا ذریعہ بنے گا۔ دیکھئے! آپ ﷺ نے خود اپنے معاملے میں کیا طرز اختیار فرمایا۔ اگر مجھے اور آپ کو کوئی آدمی کسی مجلس میں آکر ایسی بات کہہ دے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی گئی تھی تو کیا ہم اور آپ برداشت کریں گے نہیں؟ ہرگز نہیں۔

خیر! حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آپ ﷺ کس طرح اور کیا کچھ تعلیم دے رہے ہیں وہ بھی دیکھئے۔

مسجد میں پیشاب کرنے والے کو ادب کی تعلیم

ایک مرتبہ ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کے پاس مسجد میں آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے سلسلے میں کچھ سوال بھی کئے ۔ جب اس کو پیشاب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مسجد ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ وہ لوگ نئے نئے اسلام لائے تھے اور مسجد کے آداب سے واقف بھی نہیں تھے۔ نیز اس زمانے میں مسجد میں فرش نہیں ہوتا تھا، ریت ہوتی تھی وہ لوگ اپنے گھروں کے آس پاس بھی اسی طرح کرتے تھے، زمین کچی ہوتی تھی جو اس کو چوس لیتی تھی، اسی خیال سے انہوں نے اس جگہ بھی پیشاب کرلیا۔ یہ بھی دیہات کے رہنے والے تھے اس لئے مسجد کے آداب سے واقف نہیں تھے۔ ابھی انہوں نے پیشاب کرنا شروع ہی کیا تھا کہ صحابہ نے دیکھا تو دوڑے اور ان کو منع کرنے لگے، کہ مسجد ہے۔

جب حضور ﷺ نے یہ سب دیکھا تو فرمایا کہ کر لینے دو، روکو مت۔

جب انہوں نے پیشاب کرلیا تو پھر حضور ﷺ نے بالٹی بھر پانی منگوایا اور فرمایا کہ یہ پانی اس پر ڈال دو تا کہ پیشاب کی بدبو بھی ختم ہوجائے اور جب وہ جذب ہوجائے گا اور زمین سوکھ جائے گی تو آپ ہی آپ پاک بھی ہوجائے گی۔ اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ سے فرمایا: **انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین** تم لوگوں کی طرف آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، مشکل میں ڈالنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔ (بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول، نمبر: ۲۱۷)

حالانکہ وہ آدمی مسجد میں پیشاب کررہا تھا اور اس کو روکنا کچھ مشکل نہیں تھا؛ لیکن شراح نے لکھا ہے کہ پیشاب کے دوران روکتے تو دو حال سے خالی نہ تھا، یا وہ اپنے پیشاب کو روک لیتا تو یہ اس کی طبیعت کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتا اور اس پر اثر پڑتا جس کی وجہ سے بیمار ہوتا یا یہ کہ وہ اس جگہ سے بھاگتا تو مسجد کی اور زیادہ جگہ خراب ہوتی۔

بہرحال! حضور ﷺ نے یہاں ایک اور بات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بتلائی لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنے کے لیے تمہاری بعثت ہوئی ہے یعنی تم کو بھیجا گیا ہے اور متعین کیا گیا ہے۔ شراح نے لکھا ہے کہ بعثت تو کہتے ہیں کسی کو نبی بنا کر اور پیغام و خبر لے کر بھیجنے کو اور بعثت تو حضور اکرم ﷺ کی ہوئی تھی، صحابہ کی نہیں۔ اس کی وضاحت میں شراح نے یہ نکتہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ کے واسطے سے صحابۂ کرام اور امت کی بھی بعثت ہوئی تھی۔ گویا یہ بھی نبی کی طرح لوگوں

تک دین کا پیغام پہنچانے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی اس کام کے لئے وہی نبوی انداز اختیار کرنا چاہیے۔

آسانی کرو، دشواری نہیں۔

حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو نبی کریم ﷺ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کے بالائی یعنی اوپر والے حصہ اور علاقہ کا حاکم بنایا اور نیچے والے علاقے کا امیر اور حاکم حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنا کر بھیجا۔ اور جب ان کو امیر و حاکم اور گورنر بنا کر بھیجا تو بخاری شریف (مغازی:۴۰۸۶) کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ان دونوں کو نصیحت فرمائی: یسرا و لاتعسرا، تم دونوں لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرنا، مشکل نہ پیدا کرنا۔ بشرا و لاتنفرا، لوگوں کو خوش خبری کی باتیں سنائیو۔ یہاں بشرا کے مقابلہ میں و لا تنذرا آنا چاہیے، یعنی لوگوں کو ڈرائیو مت؛ لیکن اس کے مقابلہ میں و لاتنفرا لائے۔

نبی کریم ﷺ کا کلام بہت مختصر اور جامع ہوتا تھا، یہاں بھی نبی کریم ﷺ نے دو الگ الگ جملوں سے ایک ٹکڑا ذکر کر کے دو جملوں کے معانی بیان کر دیے، پوری نصیحت اصل یوں تھی:: بَشِّرَا و لاتُنْذِرَا، وَ آنِسَا وَ لاتُنَفِّرَا بشارت سنانا اور ڈرانا مت۔ اور لوگوں کو مانوس وقریب کرنا، اور نفرت مت دلانا، اور دور مت کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار کرو جس کی وجہ سے لوگ دین کے قریب ہوں۔ ان کو تو دین ہی کو سکھلانے کے لئے بھیجا جا رہا ہے۔ اور دین سکھانے والوں کا کیا

طریقہ اور انداز ہونا چاہیے یہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے۔

لوگوں کو دین کے نام پر مشکل میں مت ڈالو۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دن بھر رہتے تھے اور شام کو مغرب کے بعد اپنے محلے میں چلے جاتے تھے اور پھر وہ اپنے محلے میں عشاء کی نماز پڑھاتے تھے اور فجر کی نماز بھی اپنے ہی محلے میں پڑھاتے تھے۔ ایک روز ذرا دیر سے پہنچے، لوگ انتظار میں تھے۔ ایک تو دیر سے پہنچے اور پھر جب نماز شروع کی تو لمبی سورت شروع کر دی۔

اب جو لوگ جماعت میں شریک تھے ان میں سے ایک نے سوچا کہ اتنی لمبی سورت شروع کر دی ہے، معلوم نہیں کب پوری کریں گے، اس لئے اس نے نماز توڑ کر اکیلے اپنی نماز پڑھی اور چلا گیا۔ جب حضرت معاذ بن جبلؓ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ وہ کون تھا؟ کہا گیا کہ فلاں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ منافق معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں نماز توڑ کر چلا گیا۔

ان سے کسی نے کہا کہ تم درمیان میں نماز توڑ کر الگ نماز پڑھ کر چلے گئے تو حضرت معاذ بن جبل نے تمہارے متعلق یوں کہا کہ منافق ہے۔ اس نے کہا کہ واہ بھئی واہ! ایک تو اتنی دیر سے وہاں سے آئے اور پھر اتنی لمبی سورت شروع کر دی، ہم لوگ تو دن بھر محنت مزدوری کرنے والے ہیں، کھیتی باڑی کو پانی پلاتے ہیں، ہل جوتتے ہیں، اور دن بھر تھکے ہوئے آتے ہیں اور یہ ہے کہ نماز میں اتنی لمبی سورت پڑھنی شروع کی، یہ کیسے امام ہیں؟ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کروں گا اور پھر

انہوں نے جا کر حضور اکرم ﷺ کو بتلایا دیا کہ کل ایسا ہوا کہ اول تو حضرت معاذؓ آپ کے یہاں سے دیر سے آئے، ہم لوگ انتظار کرتے رہے اور انہوں نے آ کر جب نماز شروع کی تو لمبی چوڑی قراءت شروع کردی، میں نے دیکھا کہ بہت دیر لگے گی، تو میں نے نماز توڑ کر اپنی نماز الگ پڑھ لی، اور پھر میں چلا گیا۔ اس پر یہ مجھے منافق کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ کو بلایا اور خوب ڈانٹا، أفتان انت یامعاذ؟ اے معاذ، کیا تم لوگوں کو مشکل میں ڈالو گے؟ (بخاری، ابواب الصلوۃ، باب من شکاامامہ، نمبر: ۶۷۳)

پیار محبت والا طریقہ اپنائیں۔

بھائی! ایک زمانہ وہ تھا جب تم نے اپنے بچپن میں تعلیم حاصل کی تھی، اور اب ایک زمانہ یہ ہے جو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ وقت بدلتا جارہا ہے، زمانے کے حالات میں تبدیلی آتی جارہی ہے۔ بہت سال پہلے ہمارے بچپن کے زمانے میں یہ اصول تھا کہ بچے کو جب حافظ جی کے پاس لے کر جاتے تھے تو ان سے کہہ دیتے تھے کہ ہڈی آپ کی چمڑی ہماری۔ اب یہ صورت حال نہیں ہے اب تو ماں باپ فوراً لڑنے کے لئے آجاتے ہیں۔

بچوں کو مذہب کی بنیادی تعلیم دینا یہ ہماری خصوصیت ہے۔ ہمارے یہاں عربی مدرسوں میں کافی تعداد میں طلبہ جاتے ہیں۔ ہندؤں کے ایسے ادارے ہیں بھی تو بہت کم لوگ وہاں جاتے ہیں۔ ہر ہر بچے کو دین کی ضروری چیزوں سے واقف کرایا جائے، یہ طریقہ مسلمانوں کے علاوہ کسی اور مذہب والوں میں نہیں

ہے۔

بہر حال! بچوں کو پڑھانے کے لئے ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا ہے جو ہم اپنی اولاد کے لئے روا رکھتے ہیں اور وہ طریقہ ہے پیار و محبت والا۔

اگر ہم اپنے بچوں کو خود پڑھائیں تو سچ سچ بتلاؤ کہ ہم کون سا طریقہ اختیار کریں گے؟ ہمارے ساتھ ہمارے ماں باپ نے جو سخت سلوک کیا، کیا آج وہی سلوک ہم اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں، یا کر سکتے ہیں؟ ہم اور آپ سب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے لیے اپنے دل و دماغ کی راہ کھول دینے والے ان تمام بچوں کو اپنا بچہ سمجھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی ہم فکر کریں۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

علماء وائمہ کا مقام اوران کی ذمہ داریاں

نبی کریم ﷺ کی تفہیم کا انداز دیکھو۔ بھلی بات سیکھنے کی ترغیب دینے کے لیے آپ نے اسے **الحکمة ضالة المؤمن** سے تعبیر فرمایا۔ اس کو مومن کی گم شدہ متاع بتا کر آپ ﷺ نے آمادہ کیا کہ اس کو لینے کے لیے کسی کو پوچھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جھپٹ کر اس کو حاصل کر لینا چاہیے۔

رتن پور، دانتا۔ 24-04-2014

عنوانات

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نعوذبالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ و نعوذبالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له۔ و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له۔ و نشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده و رسوله۔ صلى الله تعالى عليه و على آله و أصحابه و بارک و سلم تسليماً كثيراً كثيراً۔ أما بعد۔

فأعوذبالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

مِنَ المؤمنين رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر و ما بدلوا تبديلاً۔

و قال تعالى: و جعلنا منهم أئمة يهدون بأمرنا لما صبروا و كانوا بآياتنا يوقنون۔

و قال النبى ﷺ: كلكم راعٍ و كلكم مسؤول عن رعيته۔ (بخارى، كتاب الجمعة، ۸۴۹)

و قال النبى ﷺ: الدين النصيحة۔ قلنا لمن يا رسول الله، قال لله و لكتابه و لرسوله و لأئمة المسلمين لعامتهم أو كما قال عليه الصلوة و السلام۔ (ترمذى، كتاب البر و الصلة)

حضرت علماء کرام اور عزیز طلبہ

ابھی ابھی مجھے کہا گیا کہ یہاں مکاتب کے مدرسین کو جمع کیا گیا ہے، ان کی نسبت سے کچھ باتیں عرض کی جائیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس قابل نہیں کہ آپ حضرات کی خدمت میں گذارشات پیش کروں؛ البتہ اپنے ہم جنسوں سے ملاقات کے وقت جو مذاکرہ ہوتا ہے، اس طرح مذاکرہ کے طور پر کچھ باتیں جو اللہ تعالی دل میں ڈالے عرض کروں گا۔ میں نے پہلے سے کچھ سوچا بھی نہیں کہ کیا کچھ عرض کرنا ہے؟ مولانا سے میں نے پوچھا کہ کونسی چیزیں خاص طور پر پیش کرنی ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ مکاتب کے مدرسین ہیں، ان کی مناسبت سے جو باتیں مناسب ہوں وہ بتلائی جائیں۔

نسبتِ علم نشانِ قبول ہے۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے محض اپنے فضل سے اپنے دین اور علم دین کے ساتھ ہم کو نسبت عطا فرمائی۔ یہ اللہ تبارک وتعالی کا وہ عظیم انعام ہے کہ ہم اور آپ اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ باری تبارک وتعالی فرماتے ہیں: ومن یؤت الحکمة فقد أوتی خیراً کثیرا۔ اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے جس کو حکمت دی جائے تو اس کو بہت بڑی خیر اللہ تعالی کی طرف سے دی گئی۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **من یرد اللہ به خیراً یفقهه فی الدین۔** (بخاری، کتاب العلم، ۷۱)

اللہ تعالی جس کے ساتھ خیر کثیر کا ارادہ کرتے ہیں، اس کو دین کی سمجھ اور دین کا علم عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالی نے اپنے دین کے علم کے لیے ہمارا انتخاب فرمایا یہ ہمارے لیے بہت بڑی سعادت کی چیز ہے۔ درمختار کے مقدمہ میں ہے: امام محمد کے انتقال کے بعد کسی نے آپ کو خواب میں دیکھا، پوچھا کہ اللہ تعالی نے

آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالی نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا: اے محمد! اگر تجھے عذاب دینا منظور ہوتا تو اپنے دین کا علم تمہارے سینے میں نہ رکھتا۔ گویا اللہ تعالی کی طرف سے علم دین عطا کیا جانا بہت بڑی سعادت کی چیز ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہمارے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔

آپ تو پڑھنے پڑھانے والے حضرات ہیں، جانتے ہیں کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے، جتنا وہ موضوع اونچا ہوتا ہے، اسی قدر وہ علم بھی اونچا سمجھا جاتا ہے۔ آپ حضرات مسلمان بچوں کی دینی، اسلامی اور ایمانی تربیت کا کام انجام دیتے ہیں، گویا آپ کا موضوع انسان سازی ہے۔ لوگوں کو اور بچوں کو؛ مسلمان بنانا بڑا عظیم کام ہے، اسی مناسبت سے آپکا مقام بھی اللہ تعالی نے بلند فرمایا ہے۔

بہر حال مکاتب کی نسبت سے دینی خدمت کی انجام دہی کا جو موقع اللہ تعالی نے عطا فرمایا ہے، وہ بڑی سعادت مندی کا مقام ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی قدر کرتے ہوئے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔

نماز باجماعت کا اہتمام:

اصل اور بنیادی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی ذات سے متعلق ہمیں فکر کرنی چاہیے۔ یعنی اللہ تعالی کے ساتھ ہماری نسبت مضبوط سے مضبوط تر ہونی چاہیے۔ اپنا عملی پہلو ہمیں اس انداز سے درست کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری ذات کی طرف کسی کو کسی معاملے میں انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔ اس نسبت کو

مضبوط کرنے کے لیے سب سے پہلی اورضروری چیز یہ ہے کہ نماز با جماعت کا اہتمام ہو۔

یہ چیز ایسی نہیں کہ اہل علم کے سامنے اس کا ذکر کیا جائے۔لیکن آج ہم جس دورِانحطاط سے گذر رہے ہیں اس میں یہ ساری چیزیں دیکھنے کومل رہی ہیں،حتی کہ بڑے عربی مدارس میں تعلیم دینے والے اساتذہ سے متعلق بھی شکایتیں ملتی ہیں۔

ایک مدرسہ کے ذمہ دار نے شکایت کی کہ ہمارے یہاں ایک مدرس ہیں،نماز باجماعت میں حاضری نہیں دیتے،ان سے اس سلسلے میں کہا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے،جس میں آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھئے !اب یہ مزاج بنتا جارہا ہے۔

نماز باجماعت کا اہتمام تو ایسی چیز ہے کہ ایک عام مسلمان پر بھی اس کا اہتمام ضروری ہے۔مسلم شریف میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے، کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں سوائے کھلے منافق کے کوئی بھی جماعت سے غیر حاضری کی جرأت نہیں کرتا تھا، جو بیمار ہوتے تھے وہ اپنی بیماری میں بھی اپنے مقدور بھر،دولوگوں کے سہارے مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

بہرحال ایک ضروری چیز نماز باجماعت کا اہتمام ہے۔

اذان ہوتے ہی مسجد میں پہنچنا

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ اذان ہوتے ہی مسجد میں پہنچا جائے۔آج کل ہماری ایک کوتاہی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے،

تلاوت، دعا، تسبیحات وغیرہ کا جو اہتمام ہونا چاہیے اس میں بھی ہمارے طبقہ کی طرف سے بہت زیادہ کمزوری پائی جاتی ہے۔ اس کا آسان علاج، جو میرے تجربہ سے بہت کامیاب ثابت ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ اذان سے پانچ منٹ پہلے مسجد میں پہنچنے کی عادت ڈالئے۔ ہمارے یہاں عام طور پر فجر کی اذان جماعت سے آدھ گھنٹہ پہلے دی جاتی ہے۔ گویا جماعت سے پینتیس منٹ پہلے آپ پہنچ رہے ہیں، ظہر میں بھی بہت سی جگہوں پر آدھ گھنٹہ اور بہت سی جگہوں پر بیس منٹ پہلے اذان ہوتی ہے۔ پانچ منٹ پہلے پہنچیں گے تو پچیس منٹ یا پینتیس منٹ پہلے پہنچنا ہوگا۔ یہی حال عصر کا ہے۔ بیس منٹ یا پندرہ منٹ کا فاصلہ ہوتا ہے، اس وقت بھی پچیس یا بیس منٹ کا وقت ملے گا۔ اسی طرح عشاء میں بھی وقت ملے گا۔

اس طرح پانچوں اوقات کی نمازوں میں آپ پانچ منٹ پہلے پہنچنے کا اہتمام کریں گے تو جو سنن قبلیہ مؤکدہ یا غیر مؤکدہ ہیں، ان کو ادا کرنے کے بعد آپ کو پندرہ، بیس منٹ کا وقفہ مل جائے گا۔ اس پندرہ بیس منٹ کے وقفہ میں قرآن پاک کی تلاوت کی جو مقدار ہے وہ بھی آپ آسانی سے پوری کرسکیں گے۔ یہ میرا اپنا تجربہ بھی ہے۔ میں ظہر اور فجر میں اسی لیے مسجد میں جلدی پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہاں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام کروں، چنانچہ اس کے نتیجہ میں اچھی خاصی مقدار میں تلاوت کی توفیق ہو جاتی ہے۔ جو حضرات ناظرہ خواں ہیں ان کو عام طور پر ہمارے یہاں سے یومیہ ایک پارہ کا معمول بتلایا جاتا ہے اور حفاظ کو تین پارے۔ اگر فجر اور ظہر ہی میں اہتمام کیا جائے تو ڈھائی تین پارے آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔

تسبیحات اور اذکار کا اہتمام ازبس ضروری ہے۔

تلاوت کے علاوہ تسبیحات، تیسرا کلمہ، درود شریف، استغفار کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔قرآن پاک میں اللہ تعالی نے جگہ جگہ پر ذکر کا حکم دیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلا (احزاب: ۴۱ - ۴۲) میں تو تمام ایمان والوں کو یہ حکم ہے۔

ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خانقاہ میں رہنے والوں کا کام ہے۔ ہم اہل مدارس کا کام تو پڑھنا پڑھانا ہے، کتابوں کا مشغلہ ہے۔ یہ سوچ صحیح نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اذکار اللہ تعالی کے ساتھ تعلق قائم کرنے والے ذرائع ہیں۔

قرآن پاک کی تلاوت، تسبیحات، ذکر، دعائیں، یہ ساری چیزیں ، بڑی پابندی کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، جب تک یہ چیزیں نہیں ہوں گی ،وہاں تک اللہ تبارک وتعالی کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہوگا۔

ان تسبیحات میں تیسرا کلمہ، درود شریف ، استغفار، اگر تین سو تین سو مرتبہ ہوجائے تو فبہا۔نہیں تو سو سو مرتبہ۔ آج کل ہمارے مشائخ سو سو مرتبہ ہی بتاتے ہیں۔

تہجد کا اہتمام

تہجد کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔تہجد بھی بہت ضروری چیز ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، **عليكم بقيام الليل ، فإنه دأب الصالحين قبلكم و مقربة لكم**

إلى ربكم، ومغفرة للسيئات۔ منهاة عن الاثم و مطردة للداء عن الجسد۔ (معجم کبیر طبرانی، ۶۱۵۴)

تم رات کے قیام کولازم پکڑو۔اس لیے کہ یہ تم سے پہلے جو صالحین گذرے ہیں ان کا طریقہ کار رہا ہے۔ہم بھی اپنے آپ کو صالحین میں زمرے میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا اہتمام کریں۔

حضراتِ صحابہ کی زندگیوں کا مطالعہ کریں، ان کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ مجتہدین، مشائخ اور فقہاء؛ ہر ایک کی زندگی میں یہ چیز گویا ایک لازمی جز کے طور پر نظر آتی ہے۔امام ابوحنیفہؒ کی ہم تقلید کرتے ہیں اور ہم سب جانتے ہیں کہ آپ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی، پوری رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔یہی حال اکثر مشائخ تھا کہ وہ رات کا بڑا حصہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔

نبی کریم ﷺ اپنی عظمت، بلند مقام اور اللہ تعالی کی طرف سے **لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک و ما تأخر** کی بشارت کے باوجود رات رات بھر قیام کا اہتمام فرماتے تھے۔آپ کے سامنے حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عائشہؓ وغیرہ کی روایتیں ہیں کہ رات کے قیام کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے قدم مبارک پر ورم آجاتا تھا۔شگاف پڑ جاتے تھے۔اور جب آپ کی خدمت میں عرض کیا جاتا تھا کہ آپ اتنا زیادہ اہتمام کیوں کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالی نے آپ کی اگلی پچھلی خطائیں معاف کردی ہیں، تو اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: **افلاأكون عبدا شكورا**۔کیا میں اللہ کا شکرگذار بندہ نہ بنوں۔

اللہ نے ہمیں بھی جو دینی اور روحانی نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ کسی اور کو نہیں دی ہیں۔ اللہ کی ان نعمتوں کا شکر یہ ہے کہ اس کے لیے ہم راتوں کو اٹھنے کا اہتمام کریں، نبی کریم ﷺ رات کا بڑا حصہ اسی طرح گذارتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ؛ وغیرہ کے حالات میں بھی یہی بات آپ کو ملے گی۔ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم کو 'رہبان باللیل وفرسان بالنہار' کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ دن بھر میدان جنگ میں مشغول رہتے، اوراس کے باوجود راتوں کو کھڑے ہونے کا اہتمام کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ رات کا قیام ہمارا خاص امتیازی وصف تھا، وہ ہم اہل علم سے ختم ہوتا جارہا ہے۔ اگراس کی عادت ڈالیں گے تو اس کی برکت سے اللہ تعالی بہت کچھ نوازیں گے۔ اللہ تعالی جس کو نوازنا چاہتا ہے اس کو اولاً اس نعمت سے بہرہ ور فرماتے ہیں۔

و مقربة لكم إلى ربكم۔ اور تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے قرب کا ذریعہ ہے۔

مغفرة للسيئات اور گناہوں کا کفارہ ہے۔

منهاة عن الاثم۔ گناہوں سے اور اللہ کی نافرمانی سے روکنے والا ہے۔ ہم اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی تدبیر کرتے ہیں، سب سے بہترین تدبیر یہ ہے کہ آدمی قیام اللیل کا اہتمام کرے، اس کی برکت سے اللہ تبارک وتعالی اس کو وہ عزم وارادہ اور وہ روحانی طاقت وقوت عطا فرماتے ہیں کہ اس سے گناہوں سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔

مطردة للداء عن الجسد۔ اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہ بیماری کو جسم سے بھگانے والی چیز ہے۔ اطباء بھی کہتے ہیں اور کتابوں میں باقاعدہ ایسی صراحت موجود ہے کہ جو لوگ تہجد کا اہتمام کرتے ہیں عام طور پر وہ صحت مند ہوتے ہیں، چاق و چوبند ہوتے ہیں، ان کی زندگی کو آپ دیکھیں گے تو اپنے فرائض منصبی کے ادائیگی کے معاملہ میں کسی سستی اور کسل مندی کا شکار نہیں ہوتے۔ بڑے مستعد رہتے ہیں۔ یہ گویا زندگی میں ایک نشاط پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ بہر حال تہجد بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کسی دینی خدمت میں جان نہیں پڑتی۔

تہجد کے علاوہ دیگر نوافل کا بھی اہتمام کرنا ہے۔ بزرگوں کو دیکھا، دو نمازوں کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ اوابین اور تہجد۔ باقی نمازیں، اشراق اور چاشت کی نمازیں، ہمارے تعلیمی اوقات ہوتے ہیں۔ البتہ ان دو نمازوں میں تقریباً سب ہی کو دیکھا کہ اس کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔

تلاوت کا اہتمام

ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ، آدمی دینی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مدرسوں میں پڑھا رہے ہیں، حدیث کا درس دے رہے ہیں؛ لیکن ان سے آپ پوچھیں گے کہ آپ روزانہ قرآن پاک کتنا پڑھتے ہیں؟ آدھا پارہ؟ نہیں۔ پاو پارہ؟ نہیں۔ کہتے ہیں کہ مطالعہ کی وجہ سے وقت نہیں ملتا ہے۔ ویسے ہمیں باتیں کرنے کے لیے وقت ملتا ہے۔ مجلس بازی کا وقت ملتا ہے۔ لغویات کے لیے وقت ملتا ہے؛ لیکن قرآن پاک کی تلاوت کے لیے وقت نہیں ملتا۔ حالاں کہ یہ بہت اہم چیز

ہے۔قرآن پاک کی تلاوت کے نتیجہ میں اللہ کا جو قرب حاصل ہوتا ہے کسی اور چیز سے وہ قرب حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تبارک وتعالی کو سو مرتبہ خواب میں دیکھا۔ آخری مرتبہ پوچھا: اے اللہ آپ کا قرب سب سے زیادہ کس چیز سے حاصل ہو سکتا ہے تو جواب ملا: قرآن پاک کی تلاوت سے۔ پوچھا کہ سمجھ کر یا بلا سمجھ کر۔ جواب ملا کہ سمجھ کر ہو تو بھی اور بغیر سمجھے ہو تو بھی۔(سیر اعلام النبلاء،۱۱-۳۴۵) بہر حال قرآن کا حق ہے۔خاص کر حفاظ کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

حدیث شریف میں ہے: **لا حسد إلا في الاثنين، رجل أعطاه الله كتابه، فيقوم به آناء الليل و آناء النهار**۔قرآن پاک کے حفظ کی دولت اللہ نے عطا فرمائی ہو تو اس کا حق اور اس کی شکر گذاری یہی ہے کہ آدمی راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی تلاوت کا اہتمام کرے۔

آدمی کو چاہیے کہ قرآن پاک کی تلاوت، تسبیحات، اذکار، تہجد اور مختلف اوقات کے مسنون اذکار کا اہتمام کرے۔ اس کے نتیجہ میں آدمی کو اللہ تعالی کی ذات سے ایک تعلق اور ربط قائم ہوتا ہے۔

خیر، میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارا اپنا عملی پہلو، عبادت کا پہلو مضبوط ہونا چاہیے، جب تک اس میں قوت نہ ہوگی وہاں تک ہم جن بچوں کی تربیت کر رہے ہیں، اس میں روحانی اور اخلاقی تاثیر نہ ہوگی۔

تربیت کے سلسلے میں علماء نے لکھا ہے کہ تربیت کرنے والے کی عملی زندگی ماتحتوں پر بہت زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ اس لیے اگر وہ نماز باجماعت کا پابند ہے، وہ

اذکار کا پابند ہے، وہ تلاوت کا پابند ہے، تو یہی چیز اس کے ماتحت جو تربیت پانے والے ہیں ان کے اندر بھی آئے گی۔

اخلاق اور معاملات کی درستگی

اس کے علاوہ اپنے اخلاق میں کمزوری نہ ہونی چاہیے۔ کوئی ایسی بری عادت نہ ہو۔ خاص کر کوئی ایسی عادت جو کبیرہ گناہ تک پہنچی ہوئی ہو، اس سے بھی اپنے آپ کو خاص کر بچانے کا اہتمام کریں۔ یہ بہت ہی ضروری اور اہم ہے۔

معاملات بھی ہمارے درست ہونے چاہیے۔ معاملات کی لائن سے ہماری طرف سے کوئی ایسی چیز جو لوگوں پر اور عوام پر برا اثر ڈالے، پیش نہیں آنی چاہیے۔ بہت سی جگہوں پر مالی اعتبار سے اس طرح کی چیزیں پیش آتی ہیں، جس کے نتیجہ میں اہل علم کا وقار باقی نہیں رہتا۔ اس سے بھی اپنے آپ کو خاص طور پر بچانے کی ضرورت ہے۔

اپنے اوقات صحیح طریقہ سے استعمال کریں۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ باقی اوقات کا بھی ایسا نظام بنایا جائے، جس سے ان اوقات کا صحیح استعمال ہو سکے۔

عام طور پر مکاتب میں پڑھانے والے مدرس یوں سمجھتے ہیں کہ ہمیں کوئی بڑی کتاب نہیں پڑھانی ہے، نہ ہمیں مطالعہ کی ضرورت ہے، یہ صحیح نہیں۔ بلکہ ان کو بھی چاہیے کہ مسائل سے تعلق رکھنے والی کتابیں پڑھیں، جو نئے مسائل پیش آتے ہیں ان سے واقف رہیں۔ آج کل تو بہت سے اداروں سے ماہ نامے شائع ہوتے ہیں ان میں بھی اس طرح کے مسائل اور مضامین آتے ہیں، ان کو پڑھیں۔ یا اپنے

اساتذہ سے ربط کر کے اور ان سے مشورہ کر کے آپ کی دینی خدمات کے لیے معاون ثابت ہوں، ایسے رسائل اور مضامین کو پڑھنے کا اہتمام کریں۔

اسلام مخالف پروپیگنڈہ اور جمعہ کے بیانات

اس زمانہ میں میڈیا کی طرف سے اسلام کے خلاف خوب پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، بہت سی مرتبہ آپ دیکھیں گے کہ یہ ڈیلی پرچے یعنی اخبارات، کوئی مسئلہ چھیڑ دیتے ہیں اور اس کو بنیاد بنا کر اسلام کے اوپر غلط اعتراضات کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے ذہن کو، خاص کر نوجوانوں کے ذہن کو بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے، ایسے تمام مسائل میں آپ کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ جس مسئلہ کو چھیڑا گیا ہے، اس کے متعلق معلومات حاصل کریں، اگر آپ کو اتنی صلاحیت نہیں تو آپ نے جہاں سے فراغت حاصل کی ہے، جن اساتذہ سے پڑھا ہے، ان سے رابطہ قائم کیجیے، ان کی خدمت میں جا کر دریافت کیجئے کہ آج کل اخبارات نے یہ مسئلہ چھیڑا ہوا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے، آپ سمجھئے، معلوم کیجئے اور پھر لوگوں کو بھی سمجھائیے۔ اس کا خاص اہتمام فرمائیں تاکہ میڈیا کی طرف سے ہمارے نوجوان اور عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلامی عقائد کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں، ان کو دور کیا جا سکے۔ اپنی گفتگو میں، بیانات میں، جمعہ کے بیانات میں ذکر کرنا چاہیے۔

جمعہ کے بیانات مختصر ہونے چاہیے اور اس میں جو اہم چیز ہو اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ زائد اور بے فائدہ باتیں نہ ہوں۔ بعض طلبہ کو انجمن سے بے

فائدہ باتیں کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے، مدرسہ کی طرف سے انجمن میں ایک وقت متعین ہوتا ہے تو کسی طرح ایران توران کی باتیں لاکر پانچ منٹ پوری کرتے ہیں، وہی مزاج بعد میں باقی رہتا ہے اور کسی جگہ پڑھانے جاتے ہیں تو وہاں بھی اسی طرح بیان کرتے ہیں۔

ایسا بیان ہو جو خلاصہ ہو، مغز ہو۔ آج کل تو علم کا بڑا چرچا ہے، دنیوی علوم کا بھی چرچا ہے۔ لوگ دینی علم سے بھلے ناواقف ہوں، دنیوی علوم پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے سامنے جب کوئی صحیح بات نہیں آتی تو وہ بات کرنے والے کے متعلق بدگمان ہو جاتے ہیں کہ مولوی صاحب کیسی بات کرتے ہیں؟ اس لیے لوگوں کے سامنے اسلامی تعلیمات کو صحیح انداز میں پیش کرنے ضرورت ہے؛ بلکہ سال بھر کی ایک ترتیب ہونی چاہیے اور ہر جمعہ کو ایک مخصوص موضوع سے متعلق اہم باتیں، قرآن، حدیث اور بزرگوں کے اقوال اور افادات سے ایسے انداز میں پیش کی جائیں کہ لوگ رغبت سے سنیں۔

اس میں وقت کی پابندی بھی ہونی چاہیے، مختصر، ۲۰ منٹ، ۲۵ منٹ کا بیان ہونا چاہیے۔ وقت کی پابندی نہیں کریں گے تو لوگ مسجد چھوڑ دیں گے۔ آپ کی بات نہیں سنیں گے۔ اور اگر ان کو یقین ہوگا کہ یہ اپنے وقت پر ہی بات ختم کرتے ہیں تو بڑے شوق اور رغبت سے سنیں گے۔

گردوپیش سے باخبر رہیے۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسائل سے اور موجودہ حالات سے بھی

واقفیت رکھیں، آپ جس علاقہ میں یا بستی میں کام کر رہے ہیں، وہاں کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے متعلق جو چیزیں ہیں وہ بھی معلوم ہونی چاہیے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کے دو الگ الگ علاقوں پر امیر بنا کر بھیجا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ تو مدینہ کے رہنے والے تھے، ان کو یمن کے حالات کی خبر نہیں تھی؛ لیکن حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ اصالۃً یمن ہی کے رہنے والے تھے، وہیں سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ ان کو جب بھیجا گیا تو چوں کہ وہ اپنے علاقہ کے حالات سے واقف تھے، تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے یہاں کھجور، اور جَو کی شراب بنائی جاتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل مسکر حرام۔ دیکھئے! جب حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو بھیجا جا رہا تھا تو ان کو فوراً خیال آیا کہ اس علاقہ میں لوگ اس چیز کے عادی ہیں، تو اس مسئلہ سے متعلق انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پیشگی رہ نمائی حاصل کر لی۔ معلوم ہوا کہ آپ جہاں کام کر رہے ہیں اس علاقہ میں جن مسائل سے آپ کو واسطہ پڑنے والا ہے، ان مسائل کے تعلق سے پہلے ہی سے آپ کو تیاری کر لینی چاہیے۔

تقریر اور وعظ کا موضوع

اسی طرح تقریر اور بیان موقع کے مناسب ہونا چاہیے۔

بخاری شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے۔ حدیبیہ میں قیام تھا۔ اس دوران ایک مرتبہ رات کو بارش ہوئی، صبح فجر کی نماز

سے فارغ ہوکر نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: معلوم ہے اللہ تعالی نے آج کیا فرمایا؟ صحابہ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے فرمایا کہ آج کچھ لوگ تو وہ ہیں جو میرے اوپر ایمان لائے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ یہ بارش اللہ کے فضل سے اور کرم سے برسی اور جنہوں نے یوں کہا کہ یہ بارش فلانے ستارے کی وجہ سے آئی ہے، انہوں نے میرے ساتھ کفر کیا۔ (مسلم، کتاب الایمان، نمبر ۱۷) چوں کہ زمانۂ جاہلیت میں بارش کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ جب بارش ہوتی تھی تو کہتے تھے کہ فلانے ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔ گویا بارش کی مناسبت سے ایک غلط نظریہ کی نبی کریم ﷺ نے تردید فرمائی۔ چوں کہ یہ اس کا موقع تھا اس لیے موقع کی مناسبت سے بات پیش کر کے لوگوں کی غلط فہمی دور فرمانے کی سعی فرمائی۔

یا جیسے آپ کو معلوم ہے سورج گرہن ہوا تو اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے سورج گرہن کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد خطبہ دیا جس میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے دو بڑی نشانیاں ہیں، ان کو کسی کی پیدائش کی وجہ سے یا موت کی وجہ سے گرہن لگتا نہیں ہے۔

چوں کہ زمانہ جاہلیت کا نظریہ اور لوگوں کی سوچ یہ تھی کہ سورج کو گرہن لگا ہو تو سمجھو کہ کوئی بڑا آدمی انتقال کر گیا ہوگا یا کسی بڑے آدمی کی پیدائش ہوئی ہوگی۔ اتفاق کی بات حضور ﷺ کے زمانہ میں جب گرہن ہوا تو آپ کے صاحب زادے ابراہیم کا انتقال ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سورج گرہن کی مناسبت سے کیا کرنا چاہیے وہ بھی آپ نے عملی طور پر کر کے بتلایا اور سورج گرہن سے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں اس کو بھی اپنی تقریر اور بیان کے ذریعہ دور کرنے کا اہتمام فرمایا۔

ہمارے یہاں بھی اخبارات میں سورج گرہن کی خبریں آتی ہیں۔ حساب کے ذریعہ بتا دیتے ہیں کہ سورج گرہن کب ہونے والا ہے؟ آپ گجراتی اخبارات میں دیکھتے ہوں گے، اس کے ضمیمے (પૂર્તિ) میں سورج گرہن کے موقع پر اس کے متعلق باقاعدہ لمبے لمبے مضامین دیتے ہیں کہ فلاں جگہ غسل کرنے جانا چاہیے، یہ اشنان کرو، یہ کرو، وہ کرو۔ ایک غلط اور باطل مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کے پیروکاروں کو اس موقع پر کیا کیا کرنا چاہیے، وہ بڑی تفصیل سے بتانے کا اہتمام کرتے ہیں اور ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سلسلے میں بہترین تعلیمات دی ہیں، اس کے باوجود لوگوں کو آگاہ نہ کریں، اس پر عمل کا اہتمام نہ کریں، تو اس سے بڑھ کر محرومی کی بات کیا ہوسکتی ہے۔

میں عرض کرنا چاہتا تھا کہ موقع کی مناسبت سے بات کرنے کا اہتمام کریں۔ جہاں آپ کام کر رہے ہیں وہاں اگر کسی کی شادی ہونے والی ہے، تو شادی سے پہلے ہی شادی سے متعلق اس علاقہ میں جو رسم و رواج ہے اس کے متعلق قرآن و حدیث کی تعلیمات ان کو بتلائیں۔ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ ان رسوم اور رواجوں کے کیا نقصانات ہیں؟ دینی اعتبار سے اور دنیوی اعتبار سے جو نقصانات ہیں، وہ سب کچھ لوگوں کو محبت سے، تفصیل سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ سمجھا کر

لوگوں کو اس پر عمل کے لیے آمادہ کیجئے۔ اسی طرح موت کی نسبت سے جو رسم و رواج ہوتے ہیں، ان رسم و رواج سے بچانے کے لیے پہلے ہی سے ان کی ذہن سازی کی جائے۔

بہر حال جو چیز موقع کی مناسبت سے پیش کی جائے وہ اپنا اثر رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ اور یہ سب اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ خود اس کے لیے پہلے سے تیاری کرلیں اور اپنے اساتذہ سے رابطہ رکھا کریں۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

آج ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی ہے کہ فراغت کے بعد مدرسہ چھوڑتے ہیں تو اساتذہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ حالاں کہ اقبال نے کہا ہے: پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں اس پر بہت عمل کیا۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ یعنی اپنے بڑوں سے تعلق ہمیشہ بر قرار رکھو اور موقع بہ موقع ان سے استفادہ کرتے رہو۔ ان سے اپنے معاملات اور خدمات کے سلسلے میں مشورہ اور ہدایتیں حاصل کرتے رہنا چاہیے۔

اگر آپ قریب ہیں تو خود حاضر ہو کر اور دور ہیں تو خطوط کے ذریعہ اپنے اساتذۃ کو برابر اپنے حالات سے مطلع کرتے رہیں۔ میں یہ کام کر رہا ہوں، یہ حالات ہیں، مجھے اس سلسلے میں رہ نمائی اور آپ کی طرف سے ہدایت کی ضرورت ہے۔ اس طرح ان کو اپنی خدمات سے آگاہ کیا جائے۔ اپنے بڑوں کو جب اپنے

کام سے آگاہ کرتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں، دعائیں دیتے ہیں، آپ کے کاموں سے خوش ہوکرآپ کی طرف توجہ فرمائیں گے،آپ کی حوصلہ افزائی کریں گے۔اس طرح یہی رابطہ آپ کے لیے آگے کی خدمات میں مزید ترقی کا ذریعہ بنے گا۔ یہ بہت اہم ہے۔

قدیم زمانے میں علماءفراغت کے بعد جہاں خدمت انجام دیتے تھے وہاں رہ کر اپنے اساتذہ اور بڑوں سے رابطہ قائم رکھتے تھے، اور خطوط کے ذریعہ ان سے ہدایتیں حاصل کرتے تھے، اپنے حالات سے ان کوآگاہ کرتے تھے، اپنے معاملے میں ان سے مشورے بھی کرتے تھے،آج تو ہم مشورے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔کوئی ایسا معاملہ پیش آیا تو اپنے طور پر فیصلہ کر لیتے ہیں، بعض ایسے مواقع ہوتے ہیں جہاں اپنی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مجھے یہ کرنا ہے وہاں تو بڑا اہتمام اس کا کیا جاتا ہے کسی بڑے کی مہر لگواؤں، اور چپکے سے اس ادارے سے نکل جاؤں، مہتمم کوخبر ہوجائے گی تو مجھے جانے نہیں دیں گے۔

ہمارا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ اساتذہ کی طرف سے مطالبہ نہ ہوتو بھی آپ ان کو باخبر کریں، ان کی اجازت اورمشورے کے بغیر قدم آگے نہ بڑھائیں۔ جب تک یہ مزاج نہیں بنے گا،آپ کواپنی خدمات میں ترقی حاصل نہ ہوگی۔اپنے بڑوں کے حالات کا آپ مطالعہ کریں، وہ قدم قدم پر اپنے مربیوں،مشائخ اوراساتذہ سے ہدایات بھی حاصل کرتے تھے،مشورہ بھی کرتے تھے اوران ہی کہنے کے مطابق آگے بڑھتے تھے۔اس کے نتیجہ میں اللہ تعالی نے ان کو ترقیات سے نوازا، استقامت عطا فرمائی،ان سے دین کی خدمات لی اورفتنوں سے بھی حفاظت

فرمائی۔

’پیوستہ رہ شجر سے، امید بہار رکھ‘ کا یہی مطلب ہے۔

جو ٹہنی درخت سے کٹ جاتی ہے کتنی ہی سر سبز کیوں نہ ہو، اس کو پانی میں ڈال دو گے تب بھی کٹنے کے بعد وہ سبز باقی نہیں رہے گی، پانی میں رہتے ہوئے بھی خراب ہو جائے گی۔ جب کہ جو ٹہنی درخت کے ساتھ لگی ہوئی ہے، بھلے وقتی طور پر اس کے پتے خشک ہو گئے ہوں؛ لیکن ایک وقت آئے گا کہ دوبارہ اس پر سر سبز پتے لگیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے اساتذہ کے ساتھ ہمیشہ ربط رکھا جائے۔

نوکری نہیں، بلکہ خدمت۔

جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کی انجام دہی ملازمت برائے ملازمت نہ ہو۔آج کل یہ مزاج عام ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے یہ حال تھا کہ کسی کو پوچھتے تھے کہ کیا کر رہے ہو تو اہل علم جواب دیتے کہ فلاں جگہ دین کی خدمت کر رہا ہوں، اب پوچھتے ہیں کہ کیا کر رہے ہو تو جواب دیتے ہیں کہ فلاں جگہ نوکری کر رہا ہوں۔ بڑی تعداد یہی جواب دیتی ہے، ایسے بہت کم ہیں جو یہ جملہ کہتے ہوں کہ میں خدمت کر رہا ہوں۔ ذہن میں نوکری رہتی ہے۔ حالاں کہ یہ نوکری نہیں، دین کی خدمت ہے۔اس کو نوکری سمجھ کر نہیں؛ بلکہ اس کو ہمارا فریضہ اور ہماری ذمہ داری سمجھ کر انجام دینا ہے۔ یوں سمجھو کہ ہمیں اس بستی کے بچوں کی تربیت کے لیے اللہ نے بھیجا ہے اور اس کی ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے۔

مدرسہ کے اوقات میں امانت داری

ایک تغیر یہ بھی آ گیا ہے کہ بس مکتب کے جو ڈھائی گھنٹے یا تین گھنٹے ہوتے ہیں ، وہ بھی پورے طور پر خدمت کرنے کی کوشش نہیں کرتے ؛ بلکہ اس میں بھی دیر سے پہنچتے ہیں، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ دیر سے پہنچتے ہیں، اور وہاں جانے کے بعد بھی بہت سی جگہ دیکھا گیا کہ اپنے کام میں مشغول نہیں ہوتے۔ جیسے پڑھنے کے زمانہ میں عادت ہوتی ہے کہ مغرب کے بعد درس گاہ میں آتے ہیں تو باہر کھڑے رہ کر بات چیت کریں گے، پھر اندر آنے کے بعد کچھ بات چیت کریں گے، پھر کچھ تکرار کا سلسلہ شروع ہوگا۔ یہی مزاج یہاں مکتب میں باقی رہتا ہے۔ باہر کھڑے ہو کر سب اساتذہ پانچ دس منٹ بات چیت کریں گے، پھر اندر جانے کے بعد کچھ دیر ایسے ہی بیٹھیں گے۔

حالاں کہ ایک ایک لمحہ اور ایک ایک منٹ اس خدمت میں لگانا ہم پر فرض ہے۔ اس میں جتنی بھی کمی کریں گے؛ یہ ایک طرح کی خیانت ہے۔ اب تو یہ خیال بھی ختم ہو گیا ہے کہ مجھ سے یہ خیانت ہو رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا ہمارے اکابر کا۔ وہ اپنے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتے تھے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ہمارے بہت سے اکابر کے حالات لکھے ہیں۔ حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ، مظاہر العلوم کے بانیوں میں سے ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ درس کے دوران کوئی آدمی، رشتہ دار ملاقات کے لیے آ جاتا تو اس کے آنے کا وقت ایک پرچی میں نوٹ کر لیتے تھے اور بعد

میں پانچ ،دس منٹ کے بعد چلا جا تا تھا تو اس کو بھی نوٹ کر لیتے تھے۔اس طرح سارے منٹ ملا کر اگر آدھے دن کے برابر وقت ہو گیا تو اس کے بقدر تنخواہ کٹوا لیتے تھے۔اندازہ کیجئے کتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔آج ہمیں اپنے ان اوقات کو صحیح طریقہ سے ادا کرنے کا اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اہتمام نہیں رہا۔وہ جو امانت داری کا مزاج تھا وہ نہ رہا۔ضرورت ہے کہ اس کو دوبارہ عام کیا جائے۔

اللہ تعالی کے یہاں ہم کو جواب دینا ہے،اس کے حضور میں ان ساری چیزوں کے متعلق ہمیں پوچھا جائے گا تو اس وقت ہم کیا جواب دیں گے؛ یہ تصور ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔اسی صورت میں ہم اپنے فرائض منصبی کو ادا کر سکیں گے۔کوئی ہمیں کہنے والا ہو یا نہ ہو،کوئی روکے یا نہ ٹوکے ہم خود اپنی نگرانی کریں۔

مجلس بازی کی عادت ترک کردو

اپنے اوقات میں سے مجلس بازی کی عادت ترک کردو۔

مکتب کے مدرسین عام طور پر جو دیہات میں رہتے ہیں، وہ کسی درزی کی دکان پر بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، کہیں کسی دکاندار کے ساتھ دوستی ہے تو اس کی دکان کے کونے میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔اس طرح دوستی کر کے اپنے اوقات کو ضائع کرتے ہیں، یہ درست نہیں۔ان مجلس بازیوں سے اپنے آپ کو دور رکھئے، یہ آپ کے وقار کو ختم کرنے والی چیز ہے۔اللہ نے آپ کو جو موقع دیا ہے،اس کو مطالعہ میں استعمال کیجئے۔نئی معلومات حاصل کیجئے،لوگوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ دیجئے۔

نوجوانوں اور عمر رسیدہ لوگوں کی دینی تربیت

بڑی عمر کے لوگوں کی تعلیم وتربیت کے لیے آپ کی طرف سے ہفتہ میں ایک دن ایسا ہونا چاہیے، جس میں گاؤں کے لوگوں کو نماز سکھلاؤ، عملی طور پر ان کو نماز کا طریقہ سکھلاؤ، بچوں کو تو آپ مکتب میں پڑھاتے ہی ہیں؛ لیکن بڑے لوگوں کی نماز درست کرنے کے لیے آپ کی طرف سے یہ سلسلہ جاری ہونا چاہیے۔ ہفتہ میں ایک دن ان کی نماز کی درستگی اور ایک دن ان کا قرآن صحیح کرانے کی محنت کرنی چاہیے۔ اسی طرح گاؤں کے نوجوانوں کو مانوس کر کے ان کو دین کی طرف مائل کرنے اور دین پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کرنے کی محنت کرنی چاہیے۔

بہت سوں کو دیکھا کہ وہ ایسی محنت تو کیا کرتے؟ نوجوان کرکٹ کھیلتے ہیں تو مولوی صاحب بھی ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ معاملہ الٹا کر دیا، نوجوانوں کی جو غلط چیزیں اور کھیل کود کے جو مشغلے ہیں اس میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوکر اپنے وقار کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ گاؤں میں ہر طرح کی دینی فضا قائم ہو جائے۔

جو پڑھے لکھے لوگ ہیں ان کے لیے دینی مطالعہ کی فضا قائم کیجیے۔ آپ کے یہاں گجراتی زبان رائج ہے تو اس زبان میں، رسائل، جرائد اور عام گجراتی کتابیں جو بہت سارے ادارے شائع کرتے ہیں، ان سے ایک لائبریری قائم کرنی چاہیے۔ دینی لیٹریچر کو عام کرنے کے لیے گجراتی، اردو، ہندی، انگریزی، کتابیں لا کر رکھو، اور لوگوں کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دو، تاکہ دینی معلومات کا ایک مزاج

بنے۔

اسی طرح عورتوں میں جو رسم و رواج ہوتے ہیں، ان کی اصلاح کے لیے اوراس کودور کرنے کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ ان کے درمیان اپنی بات پہنچانے کاانتظام فرمائیں۔

رفاہی اورامدادی خدمات

بستی میں کوئی مصیبت زدہ ہےتواس کی مصیبت دور کرنے کے لیےنوجوانوں کی صلاحیت استعمال کرتے ہوئے ان کوآمادہ کیاجائے، کہ بستی کےاس طرح کے لوگ بیمارہیں ان کے پاس علاج معالجہ کے لیےرقم نہیں ہوتی تو ہم جمع کرکےان کا تعاون کریں۔

اسی طرح اورکوئی اچانک آنے والی مصیبت میں عوام،خواص اورغریبوں کا تعاون ہو،ایسی مصروفیات اورخدمات لوگوں میں متعارف کروائیں۔اس کے لیے باقاعدہ طور پرتنظیم بنائیے،مگر مالیات کے ذمہ دارآپ نہ بنیں،اس کے لیےلوگوں کوترغیب دیں،اوران سے کام لیں،ان میں جوامانت دارہوں اس کے پاس ہی پیسہ امانت رکھاجائے،ان کاموں کی نگرانی ہو،سرپرستی ہو۔ پیسہ اپنے ہاتھ میں نہ رکھیں تاکہ کبھی اس میں کچھ اونچ نیچ ہوجائےتواس سےآپ کاوقارمجروح نہ ہو۔

ہر بستی میں ایک طرح کی روح ہونی چاہیےاورمستعداور چاق وچوبند عالم اگر کسی بستی میں پہنچتاہےتوبستی میں ایسی روح پھونک دیتاہےکہ وہاں کےتمام لوگوں کوفائدہ ہوتاہے۔

تبلیغ کا مقامی کام

گاؤں میں جو دعوت وتبلیغ کا کام ہوتا ہے اس میں حصہ لینا چاہیے، آج کل ہمارے مکاتب کے مدرسین فارغ ہوتے ہیں، پھر بھی یہ نہیں سوچتے کہ ہم مقامی کام میں حصہ لیں، نماز کے بعد جو کتاب پڑھی جاتی ہے اس میں بھی شرکت نہیں کرتے۔ عامی آدمی جو دعوت وتبلیغ میں حصہ لے رہا ہو وہ کتاب پڑھ رہا ہے، حالاں کہ وہ صحیح طریقہ سے اس کتاب کو پڑھ پاتا نہیں۔ اہل علم کو چاہیے اس میں حصہ لیں اور خود ہی ان ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر صحیح طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کرے۔ مقامی کام میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ آپ اپنی تعلیمی مشغولی کی وجہ سے چلہ وغیرہ نہ دیں اس میں ان کام کرنے والوں کے بے جا اصرار کے تابع ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے تعلیم کے اوقات پہلے سے بتادیں کہ میں اپنا تعلیمی وقت نہ دوں گا۔ ہاں چھٹیوں میں وقت ضرور دیجیے؛ لیکن مقامی کام میں خالی اوقات ہوتے ہیں، اس میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔ اس میں حصہ نہ لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل علم بستی کے مسلمانوں سے کٹ گئے۔ اور جن دینی امور میں ان کو جو دلچسپیاں لینی چاہیے وہ باقی نہیں رہیں۔ اس وقت اس باب میں بہت بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس چیز کی طرف توجہ دی جائے۔

مکتب کے فرائض

مکتب میں آنے والے بچوں پر بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ محنت کی

جائے۔ ان کی صفائی کا بھی خیال رکھیں، لباس صاف ستھرا ہو، ان کے ناخن کٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ان کو آداب معاشرت اور سلام کا طریقہ سکھلایا جائے۔ گھر میں داخل ہوتے وقت ماں باپ کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے؟ بڑوں کی تعظیم اور آداب کس طرح بجالانے ہیں؟ کھانے پینے کے آداب، سونے کے آداب وغیرہ؛

یہ سب الحمد للہ بتایا تو جاتا ہے، لیکن اس پر خصوصی توجہ دیں، ان کو پوچھا جائے کہ وہ اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟

انہیں بولنے کا طریقہ بتایا جائے۔ کسی علاقہ میں گالی گلوچ کی عادت ہوتی ہے، تو اس سے بھی بچنے کی تلقین اور تربیت کی جائے۔ اور ان سے شفقت ومحبت سے کام لیا جائے، مار پٹائی سے کام نہ لیا جائے۔

مار پٹائی اور طعن وتشنیع

ہمارے مکاتب میں آج ایک مزاج یہ بھی ہے کہ ذرا سی بات پر سخت پٹائی کر دیتے ہیں، اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ ویسے شریعت بھی پٹائی کی اجازت نہیں دیتی۔ نبی کریم ﷺ کا عمل یہی تھا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی کسی غلام، کسی باندی یا کسی عورت کی پٹائی نہیں کی۔

شریعت ان کو کڑوے الفاظ سنانے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ بخاری شریف میں روایت ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی باندی زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری کرو، آقا کو چاہیے کہ حد تو جاری کرائے مگر طعن وتشنیع نہ کرے۔

طعن و تشنیع سے بچوں میں ایک طرح کی ذہنی ضد پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجہ میں ان کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ خراب ہوجاتے ہیں، اس لیے طعن و تشنیع کا جو ہمارا مزاج ہے اس کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔

تعلیم کے جدید اور سہل طریقے سیکھنے چاہیے۔

پڑھانے کے بھی وہ طریقے اختیار کیے جائیں جو آسان سے آسان ہو۔ آپ کے یہاں تو مستقل طریقہ ہے ہی۔ مہتمم صاحب یہ طریقہ دوسروں کو بھی سکھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آپ کو چاہیے کہ بچوں کو سکھلانے کے جتنے طریقے ہیں ان سارے طریقوں سے واقفیت حاصل کر کے اپنے شاگردوں میں جو طریقہ مؤثر پائیں، اس سے ان کو سکھانے کی کوشش کریں۔ گویا ہماری توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ میں کون سا ایسا طریقہ اختیار کروں کہ میں اپنے شاگرد کو جلد از جلد اور بہتر سے بہتر تعلیم سے آراستہ کردوں۔ اس کے لیے کسی سے بھی سیکھنا پڑے اس میں آپ کو شرم نہ کرنی چاہیے۔

طریقۂ تعلیم سکھلانے کے لیے جمع کیا جاتا ہے تو بہت سے علماء کو یہ گراں گذرتا ہے اور وہ یوں کہتے ہیں کہ اتنے سال ہم مدرسہ میں پڑھے، کیا ہم کو آتا نہیں جو ہم کو سکھانے کے لیے کسی کو بلایا گیا؟ اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ آپ کے یہاں پالنپور میں، مہسانہ میں، بڑے بڑے شہروں میں بڑے ڈاکٹر ہوتے ہیں، بہت سے کسی فن کے ماہر اور Specialist ہوتے ہیں، ان کے متعلق کبھی آپ اخبار میں پڑھیں گے کہ فلانا ڈاکٹر جو Eye

Specialist ہے وہ ایک مہینہ کے لیے مزید ٹریننگ کے لیے امریکہ گیا ہے۔ وہ ٹریننگ کے لیے جاتا ہے اور اس کو اخبار میں دیتا ہے، وہ ٹریننگ کے لیے جانے کو اپنی بے عزتی نہیں سمجھتا بلکہ اخبار میں دے کر مزید اس کا اشتہار کر رہا ہے، اور سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے میری عزت بڑھے گی اور میری کلنک زیادہ چلے گی اور ہم یوں سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی نیا طریقہ سیکھیں گے تو ہماری عزت گھٹ جائے گی۔ مومن کی شان تو یہ ہے کہ الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن، حیث وجدہا فھوأحق بہا۔ حکمت کی بات اور اچھی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں پائے وہ اس کا حق دار ہے۔ جیسے کہ میرا قلم گم ہوگیا، راستے میں میری نظر پڑی، کیا اس قلم کو لینے کے لیے میں کسی سے پوچھوں گا کہ لے لوں؟ نہیں، جھپٹ کر لے لوں گا، بلکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا تو بھی میں چھین لوں گا کہ لاؤ میرا قلم ہے، کوئی روکے گا تو اس سے لڑوں گا۔

نبی کریم ﷺ کی تفہیم کا انداز دیکھو۔ بھلی بات سیکھنے کی ترغیب دینے کے لیے آپ نے اسے الحکمۃ ضالۃ المؤمن سے تعبیر فرمایا۔ اس کو مومن کی گم شدہ متاع بتا کے آپ ﷺ نے آمادہ کیا کہ اس کو لینے کے لیے کسی کو پوچھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جھپٹ کر اس کو حاصل کر لینا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ تعلیم کے جو بھی طریقے ہوں، آپ مختلف لوگوں سے معلوم کریں۔ جہاں ایسے مدرسین ہوں، جن کے متعلق مشہور ہوتا ہے کہ تعلیم بہت اچھی ہے، فائدہ پہنچ رہا ہے، وہاں باقاعدہ سفر کر کے جانا چاہیے، وہ کس طرح تعلیم دیتے ہیں، کیسا کام کرتے ہیں، وہ ان سے سیکھا جائے اور آ کر اس انداز سے کام کو انجام دیا جائے تاکہ ہم اپنے فرائض منصبی کو ادا کر سکیں۔

نیت خالص رکھیں

اس خدمت میں سب سے ضروری چیز نیت کا خالص ہونا ہے۔لوگوں سے کوئی طمع نہ ہو۔نیت ہی اصل ہے، ہماری نیت یہی ہو کہ میں اللہ کے احکام کو اس کے بندوں تک پہنچا رہا ہوں، اپنی بڑائی یا اپنی عزت بڑھ جائے اس کا بھی خیال نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ کے حکم کو پورا کر رہا ہوں، اس کے دین سے اللہ کے بندوں کو واقف کر رہا ہوں، اور میرا یہ فریضہ ہے کہ علم کی اس امانت کو اللہ کے بندوں تک پہنچا کر اپنے فریضہ کو ادا کروں۔کوئی دوسری نیت لوگوں سے مالی فائدہ وغیرہ حاصل کرنے کی ہر گز نہیں ہونی چاہیے۔

مفتاح الخیر بنئے۔

اللہ تعالی نے جو موقع عطا فرمایا ہے، اس موقع سے ہمیں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔اللہ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے، اس کی آپ قدر کیجئے، اور اپنے اس فرض منصبی کو پورا کرنے کا اہتمام کریں، اس طرح رہیں کہ آپ کا وجود اس بستی کے لیے ایک رحمت کا سبب ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض اللہ کے بندے وہ ہوتے ہیں جو مفتاح للخیر اور مغلاق للشر ہوتے ہیں، ان کا وجود خیر اور بھلائی کی کنجی ہوتی ہے، ان کے ذریعہ بھلائی کے تالے کھلتے ہیں، بھلائی کے راستے کھلتے ہیں، اور ان کا وجود شر اور برائی کے لیے تالے کی حیثیت رکھتا ہے، ان

کی وجہ سے برائیاں رکی رہتی ہیں۔

أین علمائکم؟

آپ نے شمائل میں پڑھا ہوگا کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کے حالات سے بے خبر نہیں رہتے تھے، بلکہ لوگوں میں کس چیز کا چرچا ہے، وہ آپ با قاعدہ معلوم کرتے تھے، اور کوئی اچھی چیز ہوتی تو اس کی حوصلہ افزائی اور اس کو تقویت پہنچاتے تھے۔ کوئی بری چیز ہوتی تھی تو اس کو دور کرتے اور لوگوں کو اس کی برائی سے واقف کرتے تھے۔

لہٰذا لوگوں کے حالات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو ہماری غفلت بڑھتی رہے اور لوگ دین کے معاملہ میں بے پروا ہو جائیں۔ آدمی اپنے ماتحتوں، اپنے شاگردوں، یا جس علاقہ اور بستی میں کام کر رہا ہے اس بستی میں رہنے والوں کے حالات سے بے خبر رہے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دین کے معاملہ میں بے پروا ہو جائیں گے۔ آپ باخبر رہیے، جو بھی کمی اور کمزوری نظر آئے، پہلی فرصت میں اس کا نوٹس لیں۔ کوئی برائی اپنا قدم جمائے اور وہ برائی آگے بڑھے اس سے پہلے ہی اس کا ازالہ ہونا چاہیے، بخاری شریف کی حدیث میں ہے، حضرت معاویہؓ ایک مرتبہ، مدینہ منورہ تشریف لائے تھے، گذر رہے تھے، اور راستے میں کسی عورت کی لگائی ہوئی مصنوعی چوٹی گری پڑی دیکھی۔ آپ کے شرطی اور محافظ نے اٹھا کر وہ آپ کے ہاتھ میں دے دی۔ روایت میں ہے کہ حضرت معاویہؓ مسجد نبوی کے منبر پر وہ چوٹی ہاتھ میں لے کر آئے اور فرمایا: أین علمائکم؟ تمہارے علماء

کہاں گئے؟ گویا علماء نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو اس کی نوبت آئی۔ اگر یہ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے تو اس کی نوبت نہ آتی۔

دینی خدمات قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

بہر حال اللہ تعالی نے یہ جو موقع عنایت فرمایا ہے، اس سے خوب فائدہ اٹھایئے، یہی ہماری دولت ہے، یہی ہمارا سرمایہ ہے، اور جتنا ہم اس میں اپنے آپ کو قربان کریں گے اتنا ہی اللہ تعالی کا قرب حاصل ہوگا، اللہ کے بندوں کو اللہ کے ساتھ جوڑنے کے لیے، اللہ کے احکام سے واقف کرنے کے لیے ہمارے بس میں جو کچھ بھی ہے اس میں ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ فرماتے تھے کہ دیکھو! کوئی کسی بھوکے کو کھانا کھلائے، کسی پیاسے کو پانی پلائے، کسی ننگے کو کپڑا پہنائے، یہ ایسا عمل ہے جس سے اللہ تعالی بہت خوش ہوتا ہے، حدیث میں آتا ہے قیامت کے روز اللہ تعالی انسانوں کو خطاب کریں گے اور فرمائیں گے، اے ابن آدم میں بھوکا تھا، تو نے کچھ کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا، باری تعالی آپ تو رب العالمین ہیں، بھلا آپ کیسے بھوکے ہوسکتے ہیں، جواب میں باری تعالی فرمائیں گے، تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلانہ بندہ بھوکا تھا، اگر اس کو کھلاتے تو مجھے وہاں پاتے، اسی طرح باری تعالی فرمائیں گے، میں پیاسا تھا، پانی نہیں پلایا۔ اللہ کی مخلوق کے ساتھ بھلائی کا جو معاملہ کیا جاتا ہے اس سے اللہ تعالی کا جتنا قرب حاصل ہوتا ہے، کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے حضرت فرماتے ہیں کہ جب اس کی جسمانی بھوک دور کرنے کے لیے جو کوشش کی

گئی، جسمانی پیاس کو دور کرنے کے لیے جو کوشش کی گئی، اس پر اللہ تعالی اتنا راضی ہے، خوش ہے، تو اگر انسان کی روحانی بھوک دور کی جائے، اللہ کے جو بندے اللہ سے دور ہیں ان کو اللہ کے ساتھ ملانے کا ہم کام کریں گے تو اس سے اللہ تعالی کتنا راضی ہوگا اور خوش ہوگا ؟

خلاصہ

اس لیے ان باتوں کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالی نے جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان صلاحیتوں کو استعمال کریں، اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر اپنی آخرت کو بنانے کی فکر کریں۔ اپنی نگرانی کا خود اہتمام فرمائیں۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں آپ پڑھیں گے کہ کبھی ذرا سا کوئی فرق نہ آنے دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے دیکھا کہ اپنی پیٹھ پر بڑا مشکیزہ لادے ہوئے، پانی لا رہے ہیں۔ پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا کہ ابھی ایک وفد فلانے ملک کا ملنے آیا تھا، جس کی وجہ سے میرے دل میں یہ خیال آ گیا تھا کہ عمر تو بہت بڑا ہو گیا، تو میں نے اپنا یہ علاج کیا کہ یہ معمولی سا مشکیزہ بھر کر لا رہا ہوں تا کہ اپنے آپ کو بتلاؤں کہ تو کون ہے۔ یہ ہے اپنی نگرانی !

اپنی تربیت کے لیے ہی ذاتی اہتمام کے ساتھ اپنے بڑوں سے رابطہ ہو۔ ان کے مشورے کے مطابق اور ان کی ہدایت کے مطابق کام انجام دیا جائے تو انشاء اللہ، کامیابی ملے گی۔

اللہ تعالی ہم سب کو اس کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

صلہ رحمی کی اہمیت

ہماری معاشرت میں گڑ بڑ کہاں ہوتی ہے؟

رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے بعد ہم امیدیں باندھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی اچھا سلوک کریں۔ اگر آپ مال دار ہیں اور وہ غریب ہیں، تو آپ ان سے کسی مالی تعاون کی تو امید نہیں رکھیں گے؛ لیکن یہ توقع ضرور رکھیں گے کہ وہ میرا شکریہ ادا کریں، میں ملوں تو سلام ماریں، سلیوٹ کریں۔ لوگوں کے درمیان میری تعریف کریں، یوں کہیں کہ ہمارے فلاں رشتہ دار تو ہمارے ساتھ یہ بھلائی کرتے ہیں، یوں کرتے ہیں، توں کرتے ہیں۔ اور ذرا اس میں کمی آ گئی تو ہم جو سلوک کرتے ہیں اس میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ للہ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُباللہ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَاوَمِنۡ سَیِّئَآتِ اَعۡمَالِنَا مَن یَّھۡدِہٖ اللہ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضۡلِلۡہٗ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَ نَشۡھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ، صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡماً کَثِیۡراً کَثِیۡراً۔أمابعد

یَا أَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُم مِّن نَّفۡسٍ وَاحِدَۃٍ وَ خَلَقَ مِنۡھا زَوۡجَھَا وَبَثَّ مِنۡھُمَا رِجَالاً کَثِیۡراً وَنِسَاءوَاتَّقُواۡ اللہَ الَّذِیۡ تَسَاءلُونَ بِہٖوَ الأَرۡحَامَ إِنَّ اللہَ کَانَ عَلَیۡکُمۡ رَقِیۡباً(النسآء:1)

وقال تعالی: وبِالۡوَالِدَیۡنِ إِحۡسَاناً(اسراء:۲۳)

وعَنۡ أَبِي ھُرَیۡرَۃَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: إِنَّ اللہَ خَلَقَ الۡخَلۡقَ حَتَّی إِذَا فَرَغَ مِنۡ خَلۡقِہِ قَالَتِ الرَّحِمُ ھَذَا مَقَامُ الۡعَائِذِ بِك مِنَ الۡقَطِیعَۃِ قَالَ نَعَمۡ أَمَا تَرۡضَیۡنَ أَنۡ أَصِلَ مَنۡ وَصَلَكِ وَأَقۡطَعَ مَنۡ قَطَعَكِ قَالَتۡ بَلَی یَا رَبِّ قَالَ فَھُوَ لَكِ قَالَ رَسُولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم: فَاقۡرَؤُوا إِنۡ شِئۡتُمۡ ﴿فَھَلۡ عَسَیۡتُمۡ إِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ أَنۡ تُفۡسِدُوا فِي الأَرۡضِ وَتُقَطِّعُوا أَرۡحَامَکُمۡ﴾ (البخاری:۵۹۸۷)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم إِنَّ مِنۡ أَبرِّ الۡبِرِّ صِلَۃُ الرَّجُلِ أَھۡلَ وُدِّ أَبِیۡہِ بَعۡدَ أَنۡ یُوَلِّی(مسلم ۴۶۳۷، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل صلۃ أصدقاء الأب)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَنۡ أَحَبَّ أَنۡ یُبۡسَطَ لَہٗ فِی رِزۡقِہِ وَیُنۡسأَ لَہٗ فی أَثَرِہٖ فَلۡیَصِلۡ

رَحِمَهُ (بخاری شریف : ۵۵۵۴، کتاب الأدب، باب من أحب أن يبسط له الخ)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تَعَلَّمُوا مِنَ أَنْسَابِكم مَا تَصِلُونَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ فَإِنَّ صِلَةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةٌ فِيْ الْأَهْلِ ، مَثْرَاةٌ فِيْ الْمَالِ ، مَنْسَأَةٌ فِيْ الْأَثَرِ ۔ أو كما قال عليه الصلاة والسلام۔ (مشكوة شريف، كتاب الأدب، باب البر والصلة)

بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعا دی

حضرات علماء کرام، میرے مسلمان بھائیو، اور گھروں میں بیٹھی ہوئیں مسلمان مائیں، بہنیں اور بیٹیاں!

آپ حضرات نے میرے یہاں کے چند روزہ قیام میں میرے ساتھ جس محبت کا معاملہ فرمایا، میں تو اس کا کیا بدلہ دے سکتا ہوں؟ جس ذاتِ عالی کی نسبت سے آپ نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے، میں اسی ذات سے دُعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ دنیا اور آخرت میں آپ حضرات کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے: ؎

گدا کو بھی اہلِ کرم کم نہ سمجھیں　　　　بہت کچھ دیا جس نے دل سے دُعا دی

اللہ تعالیٰ مجھے مزید دعا کی توفیق دے۔ میں آپ سب کے لیے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس محبت کا صلہ عطا فرمائے۔ اللہ واسطے کی یہ وہی محبت ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی بشارتیں سنائی ہیں۔

ابھی آپ کے سامنے جو آیتِ کریمہ پیش کی گئی، وہ سورۂ نساء کی سب سے پہلی آیت ہے، نکاح کے خطبہ میں بھی یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے

ہیں: اے لوگو! ڈرو اپنے اُس پرودگار سے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا یعنی ان ہی سے ان کا جوڑا بھی پیدا کیا۔ حضرت حوّاء علیہا السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا (مرقاۃ، کتاب النکاح۔ نووی شرح مسلم، کتاب الرضاع) وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً اور پھر ان دونوں سے بہت سارے مردوں اور عورتوں کو پیدا کیا اور دنیا میں پھیلایا۔

حضرت آدم کی اولاد میں نکاح کی ترتیب

شروع میں یہ ہوتا تھا کہ حضرت آدم اور حضرت حوا سے جو بھی اولاد ہوتی تھی وہ جوڑیاں (یعنی لڑکا اور لڑکی) ہی ہوتی تھیں۔ آج ایک جوڑا لڑکا اور لڑکی کا پیدا ہوا، بعد میں دوسرا جوڑا پیدا ہوتا تھا۔ بڑے ہونے پر پہلے لڑکے کے ساتھ جو لڑکی پیدا ہوئی، اس کے ساتھ کل والے لڑکے کا نکاح اور اس لڑکی کا اس لڑکے سے نکاح ہوتا تھا۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ آپ نے سنا ہوگا جس کی تفصیل میں اس وقت جانا نہیں چاہتا۔

ون سائڈ ٹریفک

وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِي تَسَاءلُونَ بِهِ وَالأَرْحَامَ إِنَّ اللهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا

اور ڈرو اپنے اس اللہ سے جس کا واسطہ دے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے سوال کیا کرتے ہو، اور رشتہ داریوں کا بھی خیال رکھو، یعنی اس سے بھی ڈرا

کرو۔ بیشک اللہ تعالی تم پر نگران ہے۔

آیت کے اس آخری حصے میں دو چیزوں سے ڈرنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا۔ ایک یہ کہ اللہ سے ڈرو، جس کا تم آپس میں واسطہ دیا کرتے ہو، اللہ کا نام پیش کر کے اپنے حقوق کا ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو۔

اگر کسی کا حق دوسرے پر باقی ہے اور وہ ادا نہیں کرتا تو دنیا میں یہ ہوتا ہے اگر وہ طاقت ور ہے تو وہ اپنا حق دوسرے کو مار کر بھی لے لیتا ہے؛ اور اگر صاحبِ حق بزورِ طاقت دوسرے سے اپنا حق وصول کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو ایسے موقع پر وہ اللہ کا واسطہ دیتا ہے کہ اللہ کے واسطے میرا حق ادا کردو۔ اللہ سے ڈرو۔ اسی کو باری تعالی فرماتے ہیں کہ جب اپنے سے قوی اور مضبوط لوگوں سے اپنا حق وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو اللہ کا واسطہ دیا کرتے ہو اور اس کا نام بیچ میں رکھ کر اپنا حق وصول کرتے ہو تو پھر دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں بھی تم کو اللہ سے ڈرنا چاہیے، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور ان کے حقوق کو ادا کرو۔

یہ کیا بات ہوئی کہ سامنے والا آپ کا حق ضائع کر رہا ہو اور ادا نہ کر رہا ہو تب تو اللہ کا واسطہ دے کر اپنا حق مانگتے ہو، اور جب دوسروں کا حق دینے کا وقت آئے تو اُسی اللہ کو بھول جاؤ اور اُس اللہ سے نہ ڈرو! یہ تو ون سائڈ One Side ٹریفک ہوئی، ٹریفک تو دونوں سائڈ چلنی چاہیے۔ آپ اپنا حق مانگنے کے لئے جب اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتے ہو تو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں بھی اس اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ضروری ہے۔

رشتہ داریوں کی تفصیل

دوسرے نمبر پر جن چیزوں سے ڈرایا گیا وہ 'الْأَرْحَام' یعنی رشتہ داریاں ہیں۔

اہلِ علم موجود ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ اس آیت میں 'وَالْأَرْحَام' کا عطف 'اللہ' پر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع اور برباد کرنے سے بھی ڈرو۔ رشتہ داریوں کے حقوق کی کس قدر اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا۔

'أَرْحَام'، رَحِم کی جمع ہے۔ اور 'رَحِم' عربی زبان کا لفظ ہے، عورت کے پیٹ میں موجود بچہ دانی کو کہتے ہیں، نطفہ اور حمل اسی میں قرار پاتا ہے اور اسی میں بچہ نو ماہ تک- یا جتنا بھی اللہ تعالیٰ کو اندر رکھنا منظور ہوتا ہے- پرورش پاتا ہے، بچہ دنیا میں آتا ہے تو ماں کے پیٹ سے ان سارے رشتوں کو لے کر آتا ہے، چنانچہ نسب اور خاندان کی وجہ سے جتنے رشتے بنتے ہیں ان تمام رشتوں اور تعلقات کو قرآن اور حدیث میں لفظ 'رحم' سے تعبیر کیا گیا ہے، کیوں کہ ان سارے تعلقات کی بنیاد یہی ہے۔

ایک بچہ جب ماں کے پیٹ سے دنیا میں آتا ہے، تو باپ اور ماں؛ دونوں کے نطفہ کے مجموعے سے وہ بن کر آتا ہے، اس لیے اس کی تمام رشتہ داریوں کی بنیاد اور جڑ ماں اور باپ ہیں۔

جس کے پیٹ سے یہ پیدا ہوا وہ اُس کی ماں کہلائے گی، پھر آگے کے

سارے رشتے اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ماں کا باپ نانا کہلائے گا اور ماں کی ماں نانی کہلائے گی۔ ماں کا بھائی ماموں اور ماں کی بہن خالہ کہلائے گی۔ اور باپ کا باپ دادا کہلائے گا، اس کی ماں دادی کہلائے گی، باپ کا بھائی چچا یا تایا کہلائے گا۔ باپ کی بہن پھوپھی کہلائے گی۔ پھر رشتہ داریاں آگے بڑھیں گی، پھوپھی زاد بہن، پھوپھی زاد بھائی، خالہ زاد بہن، خالہ زاد بھائی۔ اسی طرح بھائی ہے، یعنی باپ اور ماں دونوں کا بیٹا۔ ہمارے ماں باپ کی دوسری اولاد ہمارے بھائی بہن ہیں۔ لڑکے ہیں تو بھائی اور لڑکیاں ہو تو بہن۔ پھر ان کی اولادیں یعنی بھتیجے، بھانجے بھتیجیاں، بھانجیاں وغیرہ، دور تک چلے جاؤ۔ یہ سارے رشتوں کے نام ہیں۔

رشتوں کی دو قسمیں۔

رشتے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک خاندانی (نسبی) جس کا ذکر ہوا۔ دوسرا سسرالی، یعنی جو شادی کے نتیجے میں قائم ہوتا ہے۔ یہ دونوں رشتہ داریاں اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہیں اور باری تعالیٰ نے ان دونوں رشتوں کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اپنی نعمت کے طور پر کیا ہے: **وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَراً فَجَعَلَهُ نَسَباً وَ صِهْراً (الفرقان: ۵۴)** وہی ذات ہے جس نے پانی کے نطفے سے انسان کو پیدا کیا اور اس کو نسبی اور سُسرالی رشتوں والا بنایا۔

یہ سسرالی رشتہ کوئی معمولی رشتہ نہیں ہے، آدمی کا نکاح جب کسی عورت کے ساتھ ہو گیا اور نکاح ہونے کے بعد دونوں آپس میں مل گئے، تو اب جو بچہ پیدا ہوگا وہ کسی ایک کا نہیں؛ بلکہ دونوں کا ہے۔ ان دونوں کے درمیاں ایسا مضبوط اور

گہرا تعلق ہو جاتا ہے کہ جس طرح آدمی پر اپنے اصول وفروع حرام ہوتے ہیں اسی طرح بیوی کے اصول وفروع بھی حرام ہو جاتے ہیں۔

ایک مرد کے لیے اپنے اصول یعنی جن عورتوں سے وہ پیدا ہوا ہے ان کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح اپنے فروع یعنی جو عورتیں اس سے پیدا ہوئی ہیں ان کے ساتھ بھی نکاح کرنا حرام ہے۔ یعنی ماں کے ساتھ، نانی کے ساتھ، اپنی بیٹی، پوتی اور نواسی کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ شادی کے بعد اسی طرح اپنی بیوی کے اصول وفروع سے نکاح کرنا بھی حرام ہے، وہ بھی اسی طرح قریبی رشتے دار بن جاتے ہیں۔

چنانچہ اب بیوی کی ماں کے ساتھ نکاح کرنا حرام، بیوی کی بیٹی سے نکاح حرام، چاہے اسکے نطفے سے نہ ہو کسی اور شوہر سے ہو، اس کی پوتی نواسی جو دوسرے شوہر سے ہو اس کے ساتھ نکاح کرنا حرام۔ گویا اپنی ماں اسی طرح بیوی کی ماں، اپنی بیٹی جیسی بیوی کی بیٹی۔

اور بیوی کے لیے بھی ایسا ہی حکم ہے۔ اس کے لیے اپنے باپ اور بیٹے سے اوپر تک اور نیچے تک نکاح کرنا حرام ہے، اسی طرح دونوں میں رشتہ پیدا ہونے کے بعد شوہر کے باپ اور بیٹوں کے ساتھ نکاح کرنا حرام، یعنی جو حکم بیوی کے لیے اپنے باپ کا ہے وہی حکم شوہر کے باپ کا ہے۔

آج کل جو نئی اولاد آرہی ہیں ان کو رشتہ داریوں کا پتہ ہی نہیں۔ بہت سے تو وہ ہیں جو دادا کو بھی نہیں جانتے کہ دادا کیا ہے اور کون ہے؟ جہاں ماں باپ اکیلے رہتے ہیں اور دادا دادی کسی دوسری جگہ رہتے ہیں، اس نئی پود کو دادا دادی کا

بھی پتہ نہیں، پردادا پردادی کا تو سوال نہیں۔ حالاں کہ پُرانے بوڑھے بوڑھیوں کے پاس آپ جائیں تو ایسی لمبی چوڑی رشتہ داریاں بیان کریں گے کہ ہم سوچتے ہی رہ جائیں۔ بہر حال آدمی کے لیے ان سب رشتوں کو جاننا ضروری ہے۔

حدیثِ پاک میں بھی اس کی تاکید آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں، ترمذی شریف کی روایت ہے: **تَعَلَّمُوا مِنْ أَنْسَابِكُمْ مَاتَصِلُونَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ** اپنی رشتہ داریوں کو جانو اور معلوم کرو- کہ کون تمہارا رشتہ دار ہے، یعنی اس کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے اور کیا رشتہ داری ہے- تاکہ تم ان رشتہ داریوں کے حقوق ادا کرسکو۔ جب تک آدمی رشتہ داری کو نہیں جانے گا وہاں تک حق کیسے ادا کرے گا؟

انگریزی کی تنگ دامنی

اور میں تو کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! ہمارے یہاں تو ان ساری رشتہ داریوں کے نام ہیں۔ باپ، ماں، دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، خالہ، پھوپھی، چچازاد بھائی، خالہ زاد بھائی، ماموں زاد بھائی وغیرہ۔ لیکن انگریزی زبان؟ اللہ کی پناہ۔ بڑی تنگ زبان۔ رشتہ داریوں کے الگ نام تک نہیں۔ ماں باپ کا الگ نام رکھ دیا، بس ہو گیا۔ اس کے بعد دادا ہو کہ نانا؛ دونوں کے لیے ایک ہی لفظ گرانڈ فادھر (grandfather) ہے۔ اور دادی ہو کہ نانی، دونوں کے لیے گرانڈ مدھر (grandmother) ہے۔ پھر چچا، تایا، ماموں، پھوپھا، خالو کوئی بھی ہو؛ ان سب کو انکل (uncle) میں سمودیا۔ اب انکل میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون ہے؟ بلکہ پوچھنا پڑے گا کہ آپ انکل کہہ رہے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے؟ باپ

کا بھائی ہے یاماں کا بھائی ہے؟ماں کا بہنوئی یعنی خالو ہے یا باپ کا بہنوئی یعنی پھوپھا ہے؟اور پھرآنٹی(Aunt) بھی ایسی ہے کہ خالہ،ممانی، چچی، پھوپھی؛سب ہی اسی میں آگئیں۔اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ رشتوں کے لئے جن کے پاس الفاظ ہی نہ ہوں تو وہ حقوق کیا ادا کریں گے؟ ہمیں تو حضور پاک ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ان رشتوں کو پہچانو اوران کو پہچان کران کے حقوق کوادا کرو۔

صلہ رحمی کے تین فائدے، پہلا: آپسی محبت

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ رشتہ داریوں کے حقوق ادا کرنے کے تین فائدے ہیں: 'مَحبَّة فِي الأَهْلِ'۔اس کے نتیجے میں رشتہ داروں میں آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے۔'مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ'اور مال میں ترقی ہوتی ہے۔'مَنْسَأَةٌ فِي الأَثَرِ' اورعمر میں بھی زیادتی ہوتی ہے۔(سنن الترمذی. بَابُ مَا جَاءَ فِي تَعْلِيمِ النَّسَبِ. حدیث نمبر: ۱۹۷۹)

پہلا یہ کہ صلہ رحمی کے نتیجہ میں خاندان والوں میں محبت پیدا ہوتی ہے،ظاہر ہے کہ آپ حقوق ادا کریں گے ان کے ساتھ اچھائی کا سلوک کریں گے تو آپس میں محبت کیوں نہ ہوگی؟

اسلام کیا ہے؟

اسلام حقوق کی ادائیگی ہی کا نام ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنا اور بندوں کا حق بتایا، پھر بندوں میں ماں کا حق الگ بتایا۔باپ کا الگ بتایا۔بھائیوں کا، بہنوں کا، بیوی

کا،شوہر کا، اولاد کا، دوسرے رشتہ داروں کا اور پڑوسیوں کا حق الگ الگ بتلایا اور پھر یہ سارے حقوق اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ادا کئے جانے ہیں۔ ہمیں اپنے رشتہ داروں سے جو سلوک کرنا ہے اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کریں گے تو معاملہ بہت آسان ہے، اس سے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؛ لیکن ہم لوگ عام طور پر اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر نہیں، بلکہ سماج اور معاشرہ کا ایک رواج سمجھ کر یہ ساری چیزیں کرتے ہیں، حالاں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور ہم کو شریعت نے یہ تعلیم دی ہے۔

صلہ رحمی اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

صلہ رحمی کا مطلب ہے: رشتہ داری کے حقوق ادا کرنا، اور قطع رحمی کا مطلب ہے: رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنا، ضائع اور برباد کرنا۔ صلہ رحمی اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔ آدمی صلہ رحمی یہ سمجھ کر کرے کہ کوئی بدلہ ملے یا نہ ملے، ہم ماں باپ کے ساتھ بھلائی کریں گے، بیوی کا حق ادا کریں گے، اولاد کے حقوق ادا کریں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؛ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کی بھی حق تلفی کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک مؤمن کا اصل رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ماں کا یہ حق ہے اس لیے وہ ادا کر رہا ہے۔ باپ کا یہ حق ہے، تو وہ ادا کر رہا ہے۔ بیوی کا یہ حق ہے تو ادا کر رہا ہے۔ شوہر کا یہ حق ہے تو ادا کر رہی ہے، اولاد کا یہ حق اللہ تعالی نے بتایا ہے، اس لیے وہ ادا کر رہا ہے۔ گویا ہر کام میں اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ کے گھر میں ٹیلیفون ہے، اس کا اصل رابطہ اور کونٹیکٹ ایکسچینج سے ہے، اور اسی ایکسچینج سے دوسروں کے کونٹیکٹ بھی ہیں۔ آپ کے پڑوس میں جو مکان ہے، اس کی اور آپ کے مکان کی دیوار ایک ہے۔ آپ کے گھر میں بھی فون ہے اور اس کے گھر میں بھی فون ہے، پھر بھی آپ اس کو فون کریں گے تو آپ کا فون سیدھا وہاں نہیں جائے گا، بلکہ آپ کا فون پہلے ایکسچینج میں جائے گا، پھر اس کے یہاں جائے گا، اور وہ جو جواب دے گا وہ بھی ایکسچینج جائے گا پھر آپ کے یہاں آئے گا۔ آپ کا تعلق ایکسچینج سے ہے اور ایکسچینج کا وہاں سے ہے۔ اسی طرح مؤمن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا اس لیے ہمیں بجالانا ہے۔

گناہ میں والدین کی اطاعت نہیں۔

اسی لئے کسی کا ایسا حکم جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا سبب بنتا ہو، پورا نہیں کیا جائے گا، جیسے باپ اگر کوئی ایسا کام کرنے کو کہے جو گناہ ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، تو ہم اس کو بجا نہیں لائیں گے۔ کیوں بھائی؟ اس لیے کہ ابّا جان! ہم ہاتھ جوڑ کر آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کی جو کچھ مانتے تھے وہ اللہ کے کہنے سے مانتے تھے، اب آپ ہمیں اللہ کی نافرمانی کا کہہ رہے ہیں؛ تو آپ کی بات کیسے مانی جائے گی؟ نبی کریم ﷺ نے اصول بتلا دیا ہے: **لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ**' (مشکوۃ شریف، کتاب الامارۃ) مخلوق کی اطاعت اور فرمانبرداری ایسے کاموں میں نہیں ہوسکتی، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ جس کے

بھی حقوق ادا کئے جاتے ہیں وہ دراصل حکمِ شریعت ہے۔ بھائی کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں، باپ کے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں، ماں کے ساتھ، چچا کے ساتھ، ماموں کے ساتھ، کسی بھی رشتہ دار کے ساتھ جو کچھ سلوک کر رہے ہیں وہ اس لئے ہے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا سلوک کرو۔

گڑبڑ کہاں ہے؟

ہماری معاشرت میں گڑبڑ کہاں ہوتی ہے؟ رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے بعد ہم امیدیں باندھتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی اچھا سلوک کریں۔ اگر آپ مال دار ہیں اور وہ غریب ہیں، تو آپ ان سے کسی مالی تعاون کی تو امید نہیں رکھیں گے؛ لیکن یہ توقع ضرور رکھیں گے کہ وہ میرا شکریہ ادا کریں، میں ملوں تو سلام ماریں، سلیوٹ کریں۔ لوگوں کے درمیان میری تعریف کریں، یوں کہیں کہ ہمارے فلاں رشتہ دار تو ہمارے ساتھ یہ بھلائی کرتے ہیں، یوں کرتے ہیں، توں کرتے ہیں۔ اور ذرا اس میں کمی آ گئی، تو ہم جو سلوک کرتے ہیں اس میں بھی کمی آ جاتی ہے۔

احسان جتلانے کی بیماری بڑھ رہی ہے۔

اور موقع آ گیا تو احسان بھی جتلا دیا جائے گا۔ حالاں کہ قرآن کریم کہتا ہے: ’لاَتُبْطِلُوْا صَدَقَاتِکُمْ بَالْمَنِّ وَالْأَذیٰ‘۔ آج کل احسان جتلانا بھی ہمارے سماج میں دھیرے دھیرے عام ہوتا جا رہا ہے، خاص طور پر عورتوں میں۔ اور اب تو مرد

بھی عورتوں جیسے بن گئے کہ وقت آنے پر جتلا دیتے ہیں کہ تیرے ساتھ میں نے یوں کیا، اس کے ساتھ یوں کیا، فلاں کے ساتھ یوں کیا۔ حالاں کہ آپ نے پڑھا ہوگا کہ برکت والی بڑی راتوں یعنی شبِ قدر وغیرہ میں جن لوگوں کی بخشش نہیں ہوتی، ان میں ایک احسان جتلانے والا بھی ہے۔ اندازہ لگاؤ، کتنا خطرناک گناہ ہے! یہ کبیرہ گناہ ہے، اس سے ساری نیکی تو برباد ہوگئ، اور نیکی برباد ہونے کے ساتھ ساتھ کبیرہ گناہ بھی ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی راتوں میں بھی اس کی مغفرت نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالی فرماتے ہیں: **لاَتُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بَالْمَنِّ وَالْأَذىٰ**۔ تکلیف پہنچا کر اور احسان جتلا کر اپنے اعمال باطل مت کرو۔

ہم میں گڑبڑ یہیں سے پیدا ہوتی ہے کہ ہم کچھ بھلائی کرتے ہیں پھر امیدیں باندھتے ہیں کہ ہماری اس بھلائی کے جواب میں وہ ہماری تعریف کرے، ہمارا شکریہ ادا کرے۔

شادی کے موقع پر ہم اس کو ہدیہ دے رہے ہیں، تو اب یہ امید کیے بیٹھے ہیں کہ کل میرے گھر جب شادی ہو تو یہ مجھے ہدیہ پیش کرے، مگر اللہ تعالیٰ ہماری ساری بیماریوں سے بخوبی واقف ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں: **وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّباً لِّيَرْبُوَ فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللهِ**۔ تم یہ ہدیہ اس لئے دیتے ہو کہ مجھے بھی ہدیہ ملے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ انسان کا یہ ایک مزاج ہے کہ ہدیہ اس لئے دیتا ہے کہ وہاں سے بھی کوئی ہدیہ ملے، اس کو حرام تو نہیں کہا؛ لیکن یہ ضرور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی اجر اور برکت نہیں ہوتی ہے۔

یہ صلہ رحمی نہیں۔

یا ہماری طرف سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کی طرف سے ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟ اگر وہ لوگ ہمارے ساتھ بھلائی کرتے ہیں تو ہم بھلائی کریں گے اور اگر وہ نہیں کرتے تو ہم بھی نہیں کرتے، اس کا نام صلہ رحمی نہیں۔

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: **لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلٰكِنِ الْوَاصِلُ الَّذِي إِذَا قَطَعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَ** (بخاری شریف: ۵۹۹۱) صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو برابر کا معاملہ کرے۔ آپ کے بھائی نے آپ کے ساتھ بھلائی کی تو آپ بھی اس کے ساتھ بھلائی کریں۔

اس نے اپنے گھر دعوت دی تو آپ بھی دعوت کریں، اس نے اپنی شادی میں بلایا تو آپ بھی اپنے گھر شادی میں بلائیں، اگر اس نے دعوت نہیں کی تو آپ نہ کریں، اس نے اپنے گھر شادی میں نہیں بلایا تو آپ کہیں کہ ہم کو بلایا نہیں، ہم کاہے کو بلائیں؟ یہ صلہ رحمی نہیں ہے۔ اور اس میں تو بھائی کی کیا خصوصیت ہے؟

کوئی اجنبی آدمی، جس کے ساتھ ہماری کوئی رشتہ داری اور تعلق نہیں، وہ بھی اگر دعوت دے گا تو ایک شریف انسان کی شرافت اور مروت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھلائی کرے، اس نے اپنے گھر دعوت دی تھی تو آپ بھی موقع دیکھ کر اس کو دعوت دیں گے، تو پھر بھائی کے احسان کرنے پر آپ نے اس کے ساتھ احسان کیا تو کونسا کمال کیا؟ شریعت کہتی ہے کہ وہ بھلائی کرے یا نہ کرے تم بھلائی کرو۔ بس تمہیں تو بھلائی کرتے ہی جانا ہے، چاہے وہ قطع رحمی کرے۔ اس حدیث میں

حضور ﷺ یہی فرماتے ہیں کہ رشتہ داری کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے کہ جب اس کے رشتہ دار بھلائی کریں تو وہ بھی بھلائی کرے، بلکہ وہ آپ کا حق ادا نہیں کرتا تب بھی آپ اس کا حق ادا کریں۔ بھائی! آپ کو گالی دیتا ہے تو بھی آپ سلام کیجیے۔ آپ کے ساتھ بھلائی نہیں کرتا تو بھی اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کیجیے؛ اس کی دعوت کریں، اس کو ہدیہ بھیجیں، یہ صلہ رحمی ہے۔

وہ سلام کرے تو ہی آپ بھی سلام کریں، اور وہ نہ کرے تو آپ نہ کریں، یہ صلہ رحمی نہیں ہے؛ یہ تو برابری کا بدلہ ہوا۔ اس کا نام صلہ رحمی نہیں ہے، صلہ رحمی تو یہ ہے کہ وہ کیسا ہی ناروا سلوک کرے، پھر بھی آپ اچھا سلوک کریں اور بدلہ کی توقع نہ رکھیں۔ آدمی کو دل میں ناراضگی اس لئے ہوتی ہے کہ پہلے سے کوئی امید باندھ لیتا ہے اور پھر اُمید پوری نہیں ہوئی تو اس سے ناراضگی ہوتی ہے؛ لیکن اگر پہلے سے امید ہی نہ باندھے تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔

کام پریسیڈنٹ کا اور بدلہ عامی سے؟

میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ ہم اپنے اس رشتہ دار سے بھلائی کر کے پھر اسی سے شکریہ یا بدلہ کی توقع قائم کرتے ہیں۔ اس طرح تو اپنی حیثیت کو ہم نے بہت گرا دیا اور بہت کم پر راضی ہو گئے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے کہ آپ کے پریسیڈنٹ نے ایک آدمی کو آپ کے پاس بھیجا اور آپ پر یہ کہلوایا کہ اس کا فلاں کام تم کر دو، اس کے ساتھ یہ بھلائی کرو کہ وہ دو روز تمہارے یہاں مہمان رہے گا، اس کو کھلاؤ، پلاؤ، اور اس کا یہ کام کر دو۔ چنانچہ آپ

نے دوروز اس کو کھلایا پلایا اور اس کا کام پورا کردیا۔

آپ کے اس احسان کے بدلہ کے طور پر از خود وہ آپ کو کچھ دینا چاہے گا تب بھی آپ اس سے کچھ نہیں لیں گے۔ آپ کہیں گے: نہیں بھائی! میرا معاملہ پریسیڈنٹ صاحب سے ہے، میں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ان کے کہنے سے کیا، مجھے تو وہاں سے پیمینٹ (Payment) لینا ہے۔ اسی طرح ہمیں اللہ تعالی کے کہنے سے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے بدلہ لینا ہے، وہ دینے والا ہے اور اس کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ ہم اتنا بڑا بدلہ چھوڑ کر چھوٹے بدلہ پر بچوں کی طرح خوش ہوجائیں، یہ کوئی بات ہوئی؟

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگئ داماں بھی ہے

ارے بھائی! دنیا کی طرف نگاہ اٹھانے کو چھوڑو۔ اگر وہ دیتا ہو تب بھی نہیں لینا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں ان سے کوئی توقع نہیں رکھنی ہے، نہ شکریہ کی نہ بدلے کی۔ یہ سارے جھگڑے اسی کے ہوتے ہیں۔

عورتوں کا اکسانا

ویسے عام طور پر مرد کا دھیان اس طرف نہیں جاتا، بلکہ عورتیں دھیان دِلاتی ہیں، بیوی یاد دِلاتی ہے کہ ارے! وہ ہی تمہارا بھائی ہے، تم اس کے بھائی نہیں ہو؟ تم اس کے ساتھ احسان کرتے ہو؛ لیکن اس کو تو تمہاری کچھ پڑی نہیں ہے۔ بہت سی مرتبہ مرد دینے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو عورت کہتی ہے کہ ان کے یہاں ایک

ماہ بعد شادی آنے والی ہے، اُس وقت موقع سے دینا۔ یعنی صلہ رحمی کرنے کے لئے بھی لمبا انتظار ہوتا ہے کہ اس کے یہاں شادی ہوتو کرو۔ آپ مجھے بتلائیے کہ حدیث میں کہیں آیا ہے کہ اگر رشتہ دار کے ساتھ بھلائی کرنی ہوتو شادی کے موقع پر ہی کرو؟

میں اپنی سُننے والی ماں بہنوں سے کہوں گا کہ صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی والا حکم پورا کرنے میں جتنا کردار اور رول عورتیں ادا کرسکتی ہیں، مرد نہیں ادا کرسکتے۔ مرد اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ خوب بھلائی کا معاملہ کریں۔ جس گھر میں رشتہ داروں سے سلوک کرنے والی عورتیں اور اللہ کی نیک بندیاں ہوتی ہیں؛ وہ گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

صلہ رحمی میں رسمیت

آج کل ہماری رشتہ داریوں کے حقوق کی ادائیگیاں بھی رسمی بن گئی ہیں۔ بھائی بہن کے ساتھ کوئی سلوک کب کرے گا؟ جب بھائی کے یہاں بیٹا بیٹی کی شادی ہے، تو بہن کو ایک جوڑا کپڑا دے گا۔ اس بہن کے پاس پہلے سے سو(۱۰۰) جوڑے ہوں گے، اس لیے یہ جوڑا الماری میں پڑا سڑتا رہے گا۔ اس کو یہ معلوم ہوگا تب بھی ایک جوڑا کپڑا ہی دے گا کیوں کہ یہی رسم ہے۔ یعنی احسان بھی رسمی ہوگیا ۔اس کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ نہیں دی جارہی ہے، اور دے بھی رہا ہے تو کب؟ جب گھر میں شادی کا موقع آیا۔ اور دنوں میں وہ بہن بھوکی مر رہی ہوتو بھی بھائی کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔ یہ کوئی رشتہ داری کے حق کی ادائیگی ہوئی؟

اس لیے رسم ورواج کے پابند ہرگز نہ بنو، اگر رسم ورواج کی بنیاد پر ایک جوڑا تو کیا؛ سو جوڑے دو گے تب بھی ایک ذرّہ برابر ثواب ملنے والا نہیں ہے۔ رسم و رواج کی وجہ سے جو کچھ کریں گے، وہ اللہ کے واسطے نہیں ہے، اس لیے ثواب کہاں سے ملے گا؟ بلکہ اللہ کے واسطے رسم ورواج کے خلاف کرو، تو واقعتاً وہ اللہ ہی کے لئے ہوگا اور ثواب بھی اس میں بہت زیادہ ہوگا۔ رسم ورواج کو توڑنے پر سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔

صلہ رحمی کا دوسرا فائدہ: روزی میں برکت۔

مثراۃ فی المال: مال میں زیادتی ہوگی۔

اسی کو بخاری شریف کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

من أحب أن يبسط له في رزقه وينسأ له في أثره فليصل رحمه

جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں برکت اور کشادگی ہو، خوب روزی ملے، اور عمر میں بھی زیادتی ہو، تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے، رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ آج کل یہ سب سے بڑا پروبلم ہے۔ جو آتا ہے کہتا ہے کہ مولوی صاحب، کاروبار میں بہت مندا ہے، روزی میں بہت بے برکتی ہے، کوئی تعویذ دو۔ تعویذ ڈھونڈتے رہتے ہیں؛ لیکن اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تدبیریں بتلائی ہیں ان تدبیروں کو اختیار نہیں کرتے، الٹی تدبیریں کرتے ہیں۔

بقول حضرت حکیم الامتؒ: لوگ وظیفچی بن گئے، مسنون اذکار تو کرتے نہیں، فرض نماز نہیں پڑھیں گے، لیکن وظیفے پڑھتے رہیں گے؛ پھر بھلا کیسے برکت

ہوگی! روزی میں برکت کا سب سے آسان اور حدیثِ پاک کا بتلایا ہوا وظیفہ یہی 'صلہ رحمی' ہے۔ بیوی آئی، اس کی وجہ سے ماں باپ سے جھگڑا کر کے الگ ہو گئے، پورے گھر سے قطع رحمی کی نوبت آتی ہے۔ پھر برکت کہاں؟

بیوی کان بھرتی ہے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ ہمارے یہاں یہ ہوتا ہے کہ باپ کا ایک بڑا بیٹا ہے، کاروبار باپ کا ہے۔ بڑا ہونے کی وجہ سے اس کو سونپا اور اب بیٹا اس کاروبار کو چلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نوجوان آدمی ہے، صلاحیتوں والا ہے، محنت کرتا ہے، اس لیے کاروبار میں بھی ترقی ہوگی، اب یہ حضرت سمجھتے ہیں کہ آہاہا، یہ جو کچھ گھر میں آرہا ہے وہ سب کچھ میں لا رہا ہوں۔

اس کے بعد شادی جو ہوئی، تو بیگم صاحبہ آئیں، وہ یہ سمجھتی ہے کہ میاں ہی سارے گھر کو چلا رہے ہیں۔ دوسرے بھائی تو بڑے ہوئے نہیں۔ کوئی اسکول پڑھ رہا ہے، کوئی مدرسہ جا رہا ہے۔ ابھی کاروبار میں لگے نہیں۔ اب وہ رات کو اپنے شوہر کے کان بھرتی ہے کہ آپ کی اتنی محنت ہے کہ صبح سے دکان پر جاتے ہیں تو شام کو آتے ہیں۔ یہ تمہارا بھائی تو برابر اسکول بھی نہیں جاتا، پیسے ایسے ہی اڑاتا رہتا ہے، ابّا تو اسی کی فیور کرتے ہیں۔ اس طرح یہ روزانہ جو کان میں پھونک مارے گی تو اس کا اثر تو ہوگا ہی۔

گھر ہونے کی وجہ سے آپس میں کچھ ناگواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ ماں باپ کے ساتھ بیٹوں کی، اولاد کی، میاں بیوی کی، مختلف ناگواریاں ہوتی ہیں، بیوی کو

ساس کے ساتھ ناگواری پیش آتی ہے۔ یہ سب ہوتا رہتا ہے، مزاج کے فرق کی وجہ سے ناگواریاں ہونا ضروری ہے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر اپنی ازواج کا حق ادا کرنے والا کون ہوگا؟ اور ازواج مطہرات اور امہات المؤمنین سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ سے محبت رکھنے والا کون ہوگا؟ اس کے باوجود حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں کہ اے عائشہ! جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اس کا بھی مجھے پتہ چل جاتا ہے اور تم مجھ سے جب ناراض ہوتی ہو اس کا بھی مجھے اندازہ ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا اللہ کے رسول ﷺ کیسے؟ فرمایا کہ جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور کسی بات پر قسم کھانے کی ضررت پیش آتی ہے تو تم کہتی ہو کہ **لا ورب محمد** اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو اور کسی بات پر قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تم کہتی ہو کہ **لا ورب ابراھیم**۔

آپ بتائیے، ناراضگی کس چیز کی؟ حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ بہت محبت فرماتے تھے، اور کیا نبی کریم ﷺ کی طرف سے حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کا امکان ہے؟ لیکن مزاج کا فرق ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے گھروں میں یہ چیزیں پیش آتی ہیں۔

کبھی گھر میں ذرا سا کچھ ہو گیا تو ناراضگی ہوئی، پھر بہو کو یعنی بیٹے کی بیوی کو، ادھر سے (اس کے ماں باپ کی طرف) بھی سپورٹ مل رہا ہے، وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ اب یہ (یعنی شوہر اپنے) ماں باپ کے ساتھ نہ رہے۔ پھر ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے روزانہ شکایات کا۔ اور دفتر میں اندراج رہتا ہے۔ آؤ تو بیان ہوتا ہے،

کہ آج تو ایسا ہوا، آج تو امی نے ایسا کیا۔ کبھی تو میاں طیش میں آ کر بیوی کی ہمدردی اور اس کے فیور میں آ کر ماں سے لڑ بیٹھتے ہیں، باپ پر ہاتھ اٹھا دیتے ہیں اور اس کا بڑا برا انجام بھگتنا ہوتا ہے۔ اب روزانہ ایسا ہوتا ہے، آدمی ہے، اثر بھی ہوگا۔

دل ہی تو ہے، نہ سنگ وخشت

ایک ہی بات بار بار سنتا ہے تو اثر ہوتا ہے، بیوی روزانہ ٹارچنگ کرتی ہے، دھیرے دھیرے اس کے دماغ میں کچھ آنے لگتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ میاں صاحب نے ماں باپ کو کہہ دیا کہ میں الگ رہوں گا۔ بیوی کی بات زیادہ غالب آ گئی۔

بیوی اور ماں کا مکالمہ

ہمارے حضرت ایک قصہ سناتے تھے کہ ساس اور بہو میں جھگڑا ہوا، ساس نے کہا کہ آنے دے میرے بیٹے کو، میں تیری پٹائی کرواتی ہوں۔ بہو کہنے لگی کہ میں بھی تو کہوں گی، وہ میری سنے گا، تمہاری نہیں سنے گا۔ تو ماں کہنے لگی: تیری کیوں سنے گا، میری سُنے گا، میں اس کی ماں ہوں۔ تو بہو کہنے لگی: تو کھڑے کھڑے کہے گی، میں پڑے پڑے کہوں گی۔ تو وہ پڑے پڑے جو کچھ کہتی ہے اس کا اثر بہت ہوتا ہے۔ بیوی جو کان بھرتی ہے تو ماں باپ کا سارا معاملہ ایک طرف رہ جاتا ہے۔ اب بیٹا یوں سمجھتا ہے کہ میں ہی کماتا ہوں اس لئے وہ اعلان کرتا ہے کہ کل سے میں الگ، میرا کاروبار الگ۔

کمزوروں کے طفیل روزی ملتی ہے۔

دیکھو بھائی! ہمارے جو نوجوان کماتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اپنے ماں باپ کو پال رہے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم کو تمہارے کمزوروں کی وجہ سے روزی ملتی ہے۔ (ابوداؤد)۔ نظر یوں آتا ہے کہ ہم کما رہے ہیں، اور ماں باپ کو کھلا رہے ہیں، اور نبی کریم ﷺ ہم کو یوں بتلا رہے ہیں کہ ماں باپ تم کو کھلا رہے ہیں۔ دیکھنے میں تو تم ہاتھ پیر مار رہے ہو، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو مل رہا ہے وہ ان کی وجہ سے ملتا ہے۔ یہ حدیث ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے، اس پر ہمارا ایمان ہونا چاہیے۔

حضور ﷺ کے ارشاد پر یقین

حضور اکرم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کا جب انتقال ہوا۔ تو وہ دودھ پیتے تھے، ابھی ڈیڑھ سال کی عمر تھی، دودھ چھڑایا نہیں گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی دودھ پلانے والی عورت آئی اور عرض کیا: اللہ کے رسول! چھاتی میں دودھ جوش مار رہا ہے۔ ماں کا دودھ چھاتی میں باقی رہتا ہے تو اس کی وجہ سے درد ہوتا ہے۔ یہ اسی درد کا ذکر کر رہی تھی۔

تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ: ابراہیم کو دودھ پلانے کے لئے اللہ نے جنت میں دودھ پلانے والی متعین کر دی ہے۔ آنکھ اُٹھا کر دیکھو، وہ نظر آئے گی۔ تو وہ کہتی ہیں کہ: اے اللہ کے رسول! نہیں؛ میں آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھوں گی،

آپ کے ارشاد پر مجھے اپنی آنکھوں سے زیادہ یقین ہے۔ دیکھئے، ایک عورت کو حضور ﷺ کے ارشاد پر کتنا زیادہ یقین تھا!

ہمیں جب حضور ﷺ بتلا رہے ہیں کہ تم کو تمہارے کمزوروں کی وجہ سے روزی ملتی ہے، اس پر ہمیں مکمل یقین ہونا چاہیے۔

یاد رکھو نوجوانو! تم کو جو کچھ مل رہا ہے تمہاری طاقت کے بل بوتے پر نہیں، سرٹیفیکیٹ کی وجہ سے نہیں، صلاحیتوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مل رہا ہے۔ بڑے بڑے عقل منداور بڑی بڑی ڈگریوں والے جوتے چٹخاتے پھر رہے ہیں، ان کے پاس جیب کے اندر ایک ڈالر بھی نہیں، لوگوں سے بھیک مانگتے ہیں، اور جو بالکل جاہل اور اناڑی ہیں، جن کو دستخط کرنا تک نہیں آتا، وہ بڑے بڑے رئیس ہیں، اور بڑے بڑے پڑھے لکھے ان کے یہاں نوکریاں کرتے ہیں۔

تو بڑا منحوس ہے: ایک دلچسپ قصہ۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ روزی کا مدار اگر پڑھائی لکھائی پر ہوتا تو جاہل دنیا میں بھوکا مرتا، لیکن معاملہ برعکس ہے، جو جاہل ہوتے ہیں، ان کے پاس پڑھے لکھوں کے مقابلہ میں خوب مال ہوتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کے وعظ میں ایک قصہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک دیہات کا رہنے والا کہیں جا رہا تھا، اؤنٹ وہ لئے ہوئے تھا، اور اونٹ پر دو بوریاں لادی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک پڑھا لکھا آدمی بھی تھا۔ دونوں سفر میں ساتھ ہیں اور باتیں

کرتے جارہے ہیں۔ اُس پڑھے لکھے نے اُس دیہاتی سے پوچھا کہ یہ اونٹ پر دو بوریاں لادرکھی ہیں ان میں کیا بھرا ہوا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک میں گیہوں ہیں اور دوسرے میں ریت بھری ہے۔ پوچھا کہ ریت کی کیا کمی؟ چاہو تو اپنے گھر کے سامنے سے سو(۱۰۰) بوریاں بھر لینا، یہ بوری میں ریت بھر کر کیوں لے جارہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ ایک طرف گیہوں ہے، اس لیے دوسری طرف توازُن برابر کرنے کے لئے دوسری بوری میں ریت بھرا ہے۔

اس نے کہا کہ اللہ کے بندے! یہ تو ڈبل وزن ہوگیا، اسی گیہوں کو آدھا ایک بوری میں اور آدھا دوسری بوری میں کردے تو وزن کم ہوجائے گا، اور اونٹ بھی جلدی چلے گا۔ اس نے کہا کہ ہاں یار! تیری بات تو بڑی معقول ہے۔ دیہاتی نے اس بوری میں سے ریت خالی کرکے آدھے گیہوں بھرے اور اونٹ پر لاد کر پھر چلنے لگے۔ اب یہ دیہاتی اپنے جی میں یوں سوچتا ہے کہ یار یہ تو بڑا عقل مند آدمی ہے، اس نے عجیب مشورہ ہم کو دیا، اس کے پاس تو بہت مال دولت ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ پوچھتا ہے کہ تیرے یہاں بکریاں کتنی ہیں؟ کہا: کچھ بھی نہیں۔ بھینس کتنی ہیں؟ کہا: کچھ بھی نہیں، گائے کتنی ہیں؟ کہا: ایک بھی نہیں۔ بیل کتنے ہیں؟ کہا: ایک بھی نہیں۔ گھوڑے کتنے ہیں؟ کہا: ایک بھی نہیں۔ تو اس نے کہا کہ میرے یہاں اتنی بھینسیں، اتنی گائیں ہیں۔ تو بڑا منحوس آدمی ہے، میں تیری بات پر عمل نہیں کرتا اور پھر وہ بوریاں اس نے اُتاردیں اور گیہوں اس میں بھرے اور دوسری بوری میں ریت بھر کے لادی اور چلنے لگا۔

توحقیقت یہ ہے کہ روزی کا مدار عقل وصلاحیت پر نہیں ہے، آپ یہ بھولنا

مت۔ جتنے نوجوان اچھا کماتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں اور ماں باپ کو دیتے ہیں، وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ ہم اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کمارہے ہیں۔ نہیں! بلکہ پتہ نہیں کون کمزور ہے جو تمہارے ذریعہ پل رہا ہے، اور اللہ تعالی اس کی وجہ سے تم کو روزی عطا فرماتے ہیں۔

عاملوں کا چکر

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بڑے صاحب زادے کاروبار چلا رہے ہیں، اب بیوی روزانہ ان کو ٹارچر (Torcher) کرتی رہتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے چارہ کہتا ہے کہ اب میں الگ ہوجاؤں گا۔

اس طرح علیحدگی ہوگئی، آج تک حضرت یوں سمجھتے تھے کہ سب کچھ آمدنی ہمارے بل بوتے اور زورِ بازو سے ہے۔ اب جو ماں باپ کا دل ٹوٹا اور بھائیوں اور دوسرے عزیزوں سے قطع رحمی ہوئی تو اس کا فوری اثر روزی پر ہوگا۔ چنانچہ کاروبار بگڑنا شروع ہوا۔

آدمی پر جب حالات آتے ہیں، تو حالات آنے پر آدمی اپنے اعمال کا جائزہ نہیں لیتا۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ میرے اعمال میں کون سی کمی آئی جس کی وجہ سے یہ حالات پیش آئے، وہ دوسروں کو دیکھتا ہے، حالات پیش آئے، کاروبار خراب ہونا شروع ہوا، پھر بھی اس کو بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ میں نے قطع رحمی کی اس کا یہ اثر ہے۔ قطع رحمی ایک ایسا گناہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی موت سے پہلے دنیا ہی میں اس کی سزا دیتے ہیں، صلہ رحمی کا نیک بدلہ بھی دنیا ہی

میں دیتے ہیں، کاروبار خراب ہونا شروع ہوا، تو بھی اپنے آپ پر نظر گئی نہیں، اور یہ سوچتا ہے کہ میں تو اتنا کماتا تھا، میں نے الگ کاروبار کیا، تو کیوں نہیں چلتا؟ ضرور کسی نے باہر کا کچھ کر دیا ہے۔ کسی نے کچھ کر دیا ہے، کون کرے گا، بھائی نے ہی کیا ہوگا۔ گھر والوں نے ہی کیا ہوگا۔

آج کل تو عاملین کی بھی کمی نہیں، کسی کے بھی پاس تعویذ لینے پہنچ جائیں گے۔ کسی کے ذہن میں اللہ کی طرف رجوع کرنے اور دو رکعت صلوۃ الحاجت پڑھ کر اللہ سے دعا کرنے کا خیال نہیں آتا۔ اللہ سے مانگنا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں۔ ذرا کچھ ہوگا تو کوئی عامل ڈھونڈھیں گے۔ گویا عامل ہی ساری دنیا کا حل ہے۔ عامل کے پاس سارا کچھ ہوتا تو وہ کیوں مارا مارا پھرتا، خود اس کو تو دیکھو۔

شیخ سعدیؒ نے گلستان میں واقعہ لکھا ہے، ایک جیوتشی کا۔ ایک جیوتشی لوگوں کو غیب کی خبریں بتایا کرتا تھا، اتفاق کہ اس کی بیوی کے ساتھ کسی کے غلط تعلقات تھے، ایک مرتبہ گھر پر پہنچا تو دیکھا کہ پرایا آدمی بیوی کے ساتھ ملوث ہے، چنانچہ اس کا جھگڑا ہوا، لوگ جمع ہو گئے۔ کسی سمجھ دار نے پوچھا، کاہے کا جھگڑا ہے؟ لوگوں اس کو بتایا تو وہ کہنے لگا کہ یہ ساری دنیا کو تو غیب کی خبریں بتاتا ہے اس کو اپنے گھر کی خبر نہیں، عاملوں کا بھی ایسا حال ہوتا ہے۔

عامل بھی فورا کہہ دیتا ہے کہ تمہارے گھر میں ہی کوئی ہے، سوچ لو، کون تمہارا دشمن ہے؟ اُسی نے کچھ کر دیا ہے، بس بات ختم ہوگئی۔

دشمنی میں اس کے ذہن میں سیدھا بھائی، بہن نظر آئیں گے، بعض تو سیدھا ماں باپ پر الزام لگاتے ہیں کہ میرے باپ نے کرایا دیا۔ کاروبار تو گیا تھا، اب

دین بھی گیا۔اس کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا کہ یہ لوگ میرے دشمن ہیں۔اب وہ اسی پٹڑی پر چل رہا ہے۔کوئی کتنا ہی سمجھائے اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔جس کے دل میں قطع رحمی کے خیالات ہوں اللہ تعالی اس کے بارے میں فرماتے ہیں، **فأصمهم و أعمی أبصارهم۔**

اب ماں باپ کو تو وہ تین سوڈالر بھیجتا تھا؛لیکن اس عامل کو پانچ سودے رہا ہے، اور یہ سلسلہ چل رہا ہے،اور کھوٹ اپنی جگہ الگ ہورہی ہے۔ارے بھائی! اگر توبہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت بھی آتی؛لیکن اب تو گناہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ایک تو ان سے الگ ہوا اور اب ان پر ہی الزام لگاتا ہے کہ یہی میرا بُرا کر رہے ہیں۔بھلا ماں باپ کسی کا کبھی بُرا کرتے ہیں؟ گجراتی میں کہاوت ہے:

છોરું કછોરું થાય પણ માવતર કમાવતર ન થાય

یعنی ماں باپ کبھی بیٹے کی بدخواہی نہیں کر سکتے، بیٹا چاہے کیسا بھی ہو؛لیکن اس بیٹے کے ذہن میں تو یہی بیٹھا ہوا ہے۔اب ایک چکّر چلتا ہے، عامل کے پاس جاتا ہے، وہ تعویذ دیتا ہے، یوں کرو، فلاں کرو، ایک دوسال تک چلا۔جب تنگ آگیا تو پھر سختی سے پکڑا کہ بھائی! دوسال سے علاج کر رہا ہے کہ جادو ہے، فلاں ہے؛لیکن اب تک کیوں ٹھیک نہیں ہورہا ہے؟ تو اب عامل کہتا ہے:

یہ تو اصل میں کچھ ڈاٹیلا ہے، دفن کررکھا ہے، وہ جب تک باہر نہیں نکلے گا کچھ ٹھیک ہونے والا نہیں۔

آج عامل کو خبر پڑی؟ دوسال پہلے کیوں پتہ نہیں چلا؟ علاج تو دوسال سے چل رہا ہے،مگر عقل ماری جاتی ہے،حقیقت تو یہ ہیکہ جو نحوست ماں باپ کی نافرمانی

اور قطع رحمی کی ہے وہی ایسی آ ڑے آتی ہے کہ اب اپنی بھول بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

روزی اللہ کا انعام ہے، اپنا کمال نہیں۔

اس لئے بھائی دیکھو! یہ نہ سمجھنا کہ میری صلاحیت ہے، کسی کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل اور اسی کا کرم ہے، اللہ اپنے فضل سے دے رہے ہیں۔ اور یہ یاد رکھو کہ اللہ کا دیا ہوا ہے، ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے اللہ نے جہاں کہا ہے وہاں خوب خرچ کرو، اپنے رشتہ داروں میں، اپنے ماں باپ پر، اپنے بھائی بہنوں پر اور اپنے ملنے جُلنے والوں پر سب پر خرچ کرو۔ اس میں ذرا بھی کمی نہیں آنی چاہئے۔ ایسے معاملہ میں بیوی رکاوٹ بنتی ہو تو عورتوں سے بھی میں کہوں گا کہ ہر گز رکاوٹ نہ بنو۔ بلکہ شوہر خرچ نہ کرتا ہو تو اس سے کراؤ، اور جو عورتیں رکاوٹ بنتی ہیں، میں مردوں سے کہتا ہوں کہ ان کی طرف توجہ نہ کرو۔ وہ آپ کی بھی اور اپنی بھی بدخواہی کر رہی ہیں۔

بہر حال، صلہ رحمی بہت اہم ہے، اس کا خیال رکھو اور کبھی بدلہ کی توقع مت رکھو کہ وہ ہمارا شکریہ ادا کریں، وہ ہماری تعریف کریں۔ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے، وہ ہم کو بدلہ دینے والا ہے، ہمیں تو اس کے خزانے سے لینا ہے۔ جو ہمارا احسان لے رہا ہے؛ وہ ہمیں کیا دے گا؟ ہم کیوں ان سے اُمید رکھیں؟ ہم تو اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھیں، وہی ہمیں دے گا۔ بس!

وہ اگر ہمارے ساتھ سلوک کرتا ہے، شکریہ ادا کرتا ہے، دُعا دیتا ہے، تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اُس کی بھی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

صلہ رحمی کا تیسرا فائدہ: عمر میں زیادتی۔

منسأة فی الأثر: عمر میں برکت ہوگی۔یعنی رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اللہ تعالی کی طرف سے دنیا میں ہی یہ بدلہ ملتا ہے کہ اس کی عمر میں برکت ہوتی ہے۔حضرت علامہ انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ رشتہ داری ایسی چیز ہے کہ وہ جس طرح دنیا میں انسان کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی اسی طرح اگر اس کا خیال رکھا جائے اور رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے تو وہ انسان کے لیے دنیا میں زیادہ رہنے کا بھی ذریعہ بن سکتی ہے۔

بہر حال! یہ چیز دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہے اور آخرت میں بھی اس کا بدلہ ملنے والا ہے، اور اس کے برعکس بھی ہے، یعنی اگر صلہ رحمی سے روزی میں برکت ہوتی ہے، عمر میں زیادتی ہوتی ہے تو قطع رحمی سے روزی میں تنگی آتی ہے اور عمر کی برکت ختم ہوجاتی ہے۔

اللہ کے دربار میں رشتہ داری کی دہائی

میں نے جو حدیث پڑھی اس کا بھی ترجمہ کردوں۔حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا، اور جب مخلوق کو پیدا کر کے فارغ ہوئے، تو رشتہ داری کھڑی ہوئی اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے عرش کا پایہ پکڑلیا۔

رشتہ داری ایک معنوی چیز ہے، اس کا کھڑا ہونا، عرش کا پایہ پکڑنا اور اللہ کے

سامنے عرض معروض کرنا؛ ان سب کا مطلب کیا ہے؟ یہ اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ اس کی کیا شکل تھی، البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان معنوی چیزوں کو بھی ایک مثالی جسم عطا کیا جاتا ہے۔علماء جانتے ہیں کہ ملاءِ اعلی میں اللہ تعالیٰ نے معنوی حقائق کو بھی شکلیں دی ہیں۔اسی طرح رشتہ داری کو بھی جسم عطا کیا اور وہ کھڑی ہوئی۔

باری تعالیٰ نے پوچھا: کیا بات ہے؟

اس نے کہا: یہ اس شخص کا کھڑا ہونا ہے جو آپ سے رشتہ داری کے حقوق ضائع ہونے سے پناہ چاہتا ہے۔

یعنی باری تعالیٰ! میں اس لئے کھڑی ہوئی ہوں کہ میں آپ سے گارنٹی چاہتی ہوں۔اللہ تعالیٰ نے جب رشتہ داری کو پیدا کیا اور رشتہ داری کے حقوق بھی اللہ نے طے کردیئے کہ یہ حقوق ہیں؛ ماں کے یہ حقوق ہیں، باپ کے یہ حقوق ہیں، بھائیوں کے یہ حقوق ہیں، بیوی کے، شوہر کے اور ساری رشتہ داریوں کے حقوق اس طرح ہیں؛ تو اس پر رشتہ داری نے یوں عرض کیا کہ باری تعالیٰ! آپ نے مجھے پیدا کیا اور میرے حقوق بھی آپ نے متعین کردیئے ،مگر میرے حقوق ادا ہوں گے، اُس کی کیا گارنٹی؟

اس لئے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جب کسی کام کے کرنے پر اس کو کوئی لالچ دیا جاتا ہے یا اس کے نہ کرنے پر کوئی دھمکی دی جاتی ہے تو وہ اس لالچ کی وجہ سے یا اس دھمکی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ان کاموں کو بھی کر بیٹھتا ہے جن سے منع کیا گیا تھا۔چوں کہ رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے پر کیا انعام اللہ کی طرف

سے دیا جائے گا، اوران حقوق کو ضائع اور برباد کرنے پر کیا سزا ملنے والی ہے یہ ابھی بتایا نہیں گیا تھا۔ اس لئے رشتے داری کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ میرے حقوق تو اللہ نے مجھے دے دیئے ہیں، لیکن پتا نہیں یہ انسان ان حقوق کو ادا کریں گے یا نہیں کریں گے؟ اس لئے رشتہ داری نے اپنے اس خطرے کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں اظہار کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ سے تحفظ اور Reservation مانگا کہ یہ بندے میرے حقوق ادا کریں اس سلسلہ میں مجھے کچھ وعدہ مل جانا چاہئے۔

تو باری تعالیٰ نے کہا: ٹھیک ہے، کیا میں یہ اعلان کردوں کہ جو تجھے جوڑے گا؛ میں اس کو جوڑوں گا، اور جو تجھے کاٹے گا؛ میں اس کو کاٹوں گا؟ رشتہ داری نے کہا: ہاں! میں اس پر راضی ہوں۔ تو باری تعالیٰ نے کہا: جا! تجھے یہ وعدہ دے دیا۔ گویا اب یہ کہہ دیا گیا کہ جو رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرے گا اللہ اس کو جوڑے گا اور جو رشتہ داری کے حقوق کو توڑے گا اللہ اس کو کاٹے گا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے: رشتہ داری عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے اور وہ ہر وقت دعا کرتی ہے کہ جو مجھے جوڑے گا اللہ اُس کو جوڑے گا اور جو مجھے کاٹے گا، اللہ اُس کو کاٹے گا۔ (مسلم: ۴۶۴۱، مشکوۃ: ۴۹۲۱) یعنی کہ اللہ نے رشتہ داری سے یہ وعدہ کر دیا ہے۔ اس لئے جو لوگ قطع رحمی کرتے ہیں، رشتہ داری کے حقوق کو ضائع کرتے ہیں، ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑی سخت وعید ہے۔

قطع رحمی کی سزا نقد ہوتی ہے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں یہ دستور رکھا ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار کو

گناہ کے باوجود پھلنے پھولنے کا موقع دیا جاسکتا ہے۔ چور چوری کے باوجود پھلتا پھولتا ہے۔ رشوت کھانے والا رشوت لیتے ہوئے بھی پھلتا پھولتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں فوراً سزا دے یہ ضروری نہیں، سزا اور اچھے کاموں کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں رکھا ہے۔ دنیا میں موت تک سب کو مہلت ملی ہوئی ہے؛ لیکن 'قطع رحمی' ایک ایسا گناہ ہے جس کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں تو سزا دیں گے ہی، دنیا میں بھی اس کی سزا آدمی کو جلدی سے دے دیتے ہیں۔ جو آدمی قطع رحمی کرتا ہے، رشتہ داری کے حقوق کو ضائع کرتا ہے، اللہ اس کو دنیا ہی کے اندر سزا دیتے ہیں۔

قطع رحمی کرنے والا ملعون ہے۔

صلہ رحمی کو اللہ تعالی کی طرف سے گارنٹی دینے کو بیان کرنے کے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی: فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُم کیا اس بات کی توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زمین میں اقتدار اور قوت عطا فرمائے تو تم زمین میں فساد پھیلاؤ اور قطع رحمی کرو۔

عام طور پر آدمی قطع رحمی کب کرتا ہے؟ جب کچھ قوت آتی ہے۔ مسلس پاور یا منی پاور؛ دو میں سے جب ایک آجاتا ہے تو دماغ پھر جاتا ہے اور رشتہ داروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالی کی کتنی سخت وعید ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں: أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰہُ یہی وہ لوگ ہیں جن کے اوپر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور اپنی رحمت سے دور کردیا۔

فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ ان کو بہرہ کردیا اوران کی آنکھوں کو اندھا کردیا۔

ہم غور سے دیکھیں گے تو بہت سے لوگ اس چیز میں مبتلا نظر آتے ہیں، ساری دنیا جا کر سمجھا رہی ہے، امیر صاحب کہیں تو بھی، مفتی صاحب کہیں تو بھی، پریسیڈنٹ صاحب کہیں تو بھی، کسی کی سننے کو تیار ہی نہیں، سب سمجھا رہے ہیں؛ لیکن وہ سمجھ ہی نہیں رہا۔ وہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کان بہرے کردیئے اور آنکھیں اندھی کردی کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صلہ رحمی، رشتہ داریوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ کی جائے۔

کہاں سے رحمت آئے گی؟

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **لا یدخل الجنة قاطع** (بخاری، کتاب الادب: ۵۶۳۸) رشتہ داری کے حقوق کو ضائع کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اوراس سے زیادہ خطرناک بات سناؤں، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں **لا تنزل الرحمة علی قوم فیهم قاطع رحم۔** مشکوۃ شریف، کتاب الآداب (۴۹۳۱) کی روایت ہے کہ اس قوم پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی ہے، جس میں ایک آدمی بھی رشتہ داری کے حقوق کو ضائع کرنے والا ہو۔ آج تو گھر گھر میں رشتہ داری کے حقوق ضائع کرنے والے ہیں، پھر کہاں سے رحمت آئے گی؟ اس قوم پر اللہ کی رحمت نہیں آتی جس میں ایک آدمی بھی ایسا ہو جو رشتہ داری کے حقوق کو ادا نہ کرتا ہو،

خاص طور پر ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی بہت ہی اہم ہے، اس لئے کہ ساری رشتہ داریوں کی جڑ ماں باپ ہیں، ماں اور باپ سے ہی سب رشتے نکلے

ہیں۔قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید فرمائی ہے۔ایک طرف اپنی وحدانیت اور اپنی عبادت کا حکم دیا گیا، وہیں ساتھ میں ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کا حکم بھی دیا جارہا ہے۔

سرخ آندھی کا انتظار کرو۔

لیکن ہوتا کیا ہے؟ وہی ہوتا ہے جس کی نبی کریم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی ہے۔ترمذی شریف (حدیث نمبر ۲۲۳۱) میں حضرت علیؓ سے روایت ہے: **إِذَا فَعَلَتْ أُمَّتِي خَمْسَ عَشْرَةَ خَصْلَةً حَلَّ بِهَا الْبَلَاءُ** میری اُمت جب پندرہ کام کرے گی تو وہ آزمائش میں مبتلا ہوجائے گی۔

إِذَا كَانَ الْمَغْنَمُ دُوَلاً: مالِ غنیمت کو ذاتی مال سمجھ لیا جائے۔

وَالأَمَانَةُ مَغْنَمًا: اور امانت کو غنیمت سمجھ لیا جائے۔

وَالزَّكَاةُ مَغْرَمًا: اور زکوۃ کو ٹیکس سمجھا جانے لگے۔

وَأَطَاعَ الرَّجُلُ زَوْجَتَهُ وَعَقَّ أُمَّهُ وَبَرَّ صَدِيقَهُ وَجَفَا أَبَاهُ: حدیث کے اسی حصے کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔جب کوئی مرد اپنی بیوی کی بات ماننے لگے اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے۔دوست کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے اور باپ کے ساتھ بے وفائی کا سلوک کرنے لگے۔دوستوں کو پارٹیاں دی جارہی ہیں اور باپ بھوکا مر رہا ہے، کھانے کو ترس رہا ہے۔

آگے اور چیزیں بھی ہیں، جو میرے موضوع سے ہٹ کر ہیں۔اخیر میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب یہ سب ہو تو **فَلْيَرْتَقِبُوا عِنْدَ ذَلِكَ رِيحًا حَمْرَاءَ أَوْ**

خَسۡفًا وَ مَسۡخًا۔ جب یہ پندرہ کام ہونے لگیں تو سُرخ آندھیوں کا انتظار کرو، جس میں آگ ہوگی اور لوگوں کو جلائے گی اور لوگ دھنسا دیئے جائیں گے، ان کے چہرے، ان کی شکلیں صورتیں بدل دی جائیں گی۔ یہ سب قیامت کے قریب ہوگا۔

ان پندرہ علامتوں میں چار تو یہ ہیں کہ بیوی کی بات مانی جائے اور ماں کی نافرمانی کی جائے۔ دوستوں کے ساتھ بھلائی کا سلوک اور باپ بیچارہ ترس رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہمارے سماج میں بڑھتا جا رہا ہے۔

سماج کا مزاج

شادی کے نتیجے میں جب بیوی شوہر کے یہاں آتی ہے تو علماء جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں تو نکاح کے نتیجے میں جزئیت اور بعضیت کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی بیوی کے ماں باپ اس کے حق میں ایسے ہی ہیں جیسے اس کے اپنے ماں باپ اور شوہر کے ماں باپ بیوی کے حق میں ایسے ہی ہیں جیسے اپنے ماں باپ۔ دونوں کے لئے ایک دوسرے کے ماں باپ، ماں باپ بن جاتے ہیں، یہ شریعت کا مسئلہ ہے۔ اِسی لئے حرمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ مگر ایک مزاج ہمارے سماج میں یہ بنتا جا رہا ہے کہ عام طور پر لڑکے کے ماں باپ یوں چاہتے ہیں کہ داماد اپنے سُسرال والوں کے ساتھ کچھ سلوک کرے ہی نہیں۔ اور اِدھر بیوی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ میرا شوہر اپنے خاندان والوں کے ساتھ کوئی سلوک کرے ہی نہیں، میرے ماں باپ کا بن کر رہ جائے۔ یہ بھی غلط، وہ بھی غلط۔

شریعت اعتدال چاہتی ہے کہ دونوں کے حقوق ادا کرو۔ ہم لڑکے کے ماں باپ سے کہیں گے کہ تم ایسا مت کہو کہ یہ اپنی بیوی کے ماں باپ کا ہو گیا، وہ بھی اس کے ماں باپ کی طرح ہیں، تمہارا بھی حق ادا کر رہا ہے۔ ہاں! اگر تمہارا حق ادا نہ کرتا ہوتو بولو کہ ہمارا حق تو ادا نہیں کرتا، جب تمہارے ساتھ پورا احسان اور سلوک کرتا ہے اور پھر کچھ سلوک اور بھلائی اپنی بیوی کے ماں باپ کے ساتھ اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ بھی کر رہا ہے تو تمہارے پیٹ میں کیوں درد ہوتا ہے؟ بلکہ اگر وہ ان کے ساتھ سلوک نہ کرتا ہوتو آپ کو چاہیے تھا کہ اس کو تاکید کرتے۔ اس لئے کہ اس کی ازدواجی زندگی اور گھریلو زندگی تب ہی ٹھیک ہو سکتی ہے جب ادھر کا معاملہ بھی ٹھیک ہو۔

اگر عورتیں گھر میں خیر و برکت چاہیں......

اسی طریقہ سے اگر شوہر بیوی کا حق ادا کر رہا ہے، اس کے ماں باپ کے ساتھ بھی بھلائی کرتا ہے، تو بعض عورتیں یوں چاہتی ہیں کہ اب یہ اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی بہنوں سے اور اپنے رشتہ داروں سے کٹ جائے۔ بعض عورتیں تو باقاعدہ پہرہ لگا دیتی ہیں اور شوہر کو بھی ایسا قبضے میں کر لیتی ہیں کہ اللہ کی پناہ! بے چارہ ماں باپ کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ پہلے بیوی کی نظر کو دیکھے گا کہ کہاں ہے؟ اس کے بعد ہی ماں باپ کی طرف دیکھنے کی ہمت کرے گا، یہ بھی غلط ہے۔ یہ سب سے خطرناک بات ہے۔ ایسی عورتوں سے میں کہوں گا کہ جو بیٹا ماں باپ کا نافرمان بنا، حدیث کی رو سے دنیا کے اندر وہ سزا پائے گا۔ اب اگر تمہارا شوہر سزا پائے گا تو

کیا تم اسے سزا سے بچا سکو گی؟ جب مصیبت میں وہ گرفتار ہوگا تو وہ مصیبت بیوی پر بھی آئے گی۔ عورتیں اگر چاہتی ہیں کہ ان کے گھروں میں خیر و برکت ہو تو اپنے شوہروں سے کہیں کہ وہ اپنے ماں باپ کا حق ادا کریں۔ اگر نہیں کرتا ہے تو اُس کو مجبور کرو۔ بیویوں کو چاہیے کہ وہ حق ادا کروائیں۔ عورتیں اس معاملہ میں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ آج کی عورتیں بہت کچھ کر رہی ہیں، لیکن غلط کر رہی ہیں۔ میں اپنی ماؤں اور بہنوں سے کہوں گا کہ اس کی طرف توجہ کرو۔ صلہ رحمی کا معاملہ مردوں کے مقابلہ میں ان کے ہاتھ میں زیادہ ہے، مرد تو اپنے کاروبار میں ایسا کھپا ہوا ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں عورتوں ہی کی خبر پر اعتماد کرتے ہوئے سارے فیصلے کرتا ہے۔ اس لئے عورتوں کو چاہیے کہ اپنے شوہروں کو ماں باپ کی نافرمانی نہ کرنے دیں۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

والدین کی اطاعت وفرمابرداری کا صلہ، تجربات کی روشنی

پاکستان کے ڈاکٹر نور احمد کا ایک رسالہ پڑھا، کنتھاریہ والوں نے بھی اس کو اردو زبان گجراتی لیپی میں شائع کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ڈاکٹری زندگی کے تجربات کے عجیب وغریب واقعات لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنے والے ہیں، ہم نے دیکھا کہ ایسی ایسی خطرناک بیماریوں سے جن سے بچنا قطعاً ناممکن تھا، ماں باپ کے ساتھ بھلائی کے نتیجے میں اللہ نے ان کو شفاء عطا فرمائی۔ اور موت کے وقت انہیں اچھی موت نصیب ہوئی۔ اور جو لوگ ماں باپ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، ان کی موت بھی بُری آتی ہے۔

انہوں نے کئی واقعات لکھے ہیں۔ دو چار آپ کو سنا دوں۔

ایمان پر خاتمہ

لکھا ہے کہ ایک پروفیسر کو بڑا روز دار ہارٹ اٹیک ہوا۔ بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی۔ ہم تمام ڈاکٹر اپنے علاج کے اندر مصروف تھے۔ قریب میں اس کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سنا کہ وہ چپکے چپکے اللہ سے دُعا کر رہی تھی: اے اللہ! میں اپنے بیٹے سے راضی ہوں، تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ کیوں کہ حملہ بڑا سخت تھا بچنے کی اُمید نہیں تھی؛ مگر میں نے دیکھا ان پروفیسر صاحب نے یعنی مریض نے زور سے کلمہ پڑھا، مسکرائے اور دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

کڈنی نے کام شروع کر دیا۔

ایک اور بیمار کے متعلق لکھا ہے کہ ایک بڑے بینک افسر تھے، بیمار ہوئے۔ بہت سے ڈاکٹروں نے علاج کیا تھا، آخر میں مجھے علاج کے لئے بُلایا گیا۔ مجھ سے پہلے اٹھارہ (۱۸) ڈاکٹر اس کا علاج کر چکے تھے اور سب نے یہ کہا تھا کہ یہ بچنے والا نہیں ہے۔ میں آیا تو میری بھی یہی رائے تھی؛ لیکن میں نے ان کے ماں باپ سے کہا کہ علاج صحیح طریقے سے سنت کے مطابق کرو۔ پہلے دو رکعت صلوۃ الحاجۃ پڑھ کر تم ماں باپ ہونے کی حیثیت سے دعا کرو، صدقہ کرو، پھر میں علاج کرتا ہوں۔ چنانچہ ایسا کیا اور تین روز تک وہ دعا کا اہتمام کرتے رہے۔ جس کے متعلق سب ڈاکٹر جواب دے چکے تھے، اٹھارہ اور ایک میں؛ کل انّیس ڈاکٹروں

نے کہا تھا کہ بچے گا نہیں، اب اس کو دیکھا کہ اس کی کِڈ نی (Kidney) نے کام کرنا شروع کیا، پیٹ کا پانی سوکھنا شروع ہوا اور وہ تندرست ہو گیا، ایسی مہلک بیماری تھی، لیکن ماں باپ کی دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیمار ٹھیک ہو گیا۔

داڑھی سے پاؤں جھاڑنے کا صلہ۔

شیخ ابواسحاق اسفرائنی کے متعلق لکھا ہے ایک آدمی نے آ کران سے عرض کیا: حضرت میں نے آج رات خواب میں دیکھا کہ آپ کی داڑھی جواہر یاقوت اور موتی سے مرصع ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا: **صدقت لأني مسحت بها البارحة قدم أمي** تو نے ٹھیک کہا۔ گذشتہ رات میں نے اس داڑھی کے ذریعہ اپنی ماں کے پیر جھاڑے تھے۔ ان کا گرد وغبار صاف کیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالی نے یہ مقام عطا فرمایا۔ (نزہۃ المجالس ومنتخب النفائس للصفوری، ۱۹۸)

ماں کا خادم حضرت موسیٰؑ کا رفیق

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اے اللہ! جنّت کے اندر جو میرا رفیق ہو مجھے بتلا دیا جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا: فلاں بستی میں فلاں بازار میں ایک قصّاب کی دکان ہے، وہ نوجوان تمہارا جنّت کا رفیق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مغرب کے وقت اس بازار میں تشریف لے گئے تو دیکھا ایک قصّاب دکان بند کرنے والا تھا۔ گوشت کا ایک ٹکڑا زنبیل میں ڈالا، دکان بند کی اور گھر جانے لگا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا: کیا تم کسی مومن کو اپنے ساتھ رکھنا پسند کرو گے؟ اس نے

کہا۔ جی ہاں ضرور۔ موسیٰ نے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ لے لو۔ قصّاب نے کہا: ٹھیک ہے۔ وہ گھر پہنچا۔ گھر جاکر اس نے گوشت پکایا۔ اس کے بعد اُس نے ایک زنبیل اُتاری۔ اس زنبیل میں دیکھا کہ ایک بڑھیا بالکل کبوتر کے بچّے کی طرح کمزور ہے۔ قصاب نے خود پکایا ہوا شوربا چمچ کے ذریعہ دھیرے دھیرے اُسے پلایا۔ یہاں تک کہ وہ سیر ہوگئی۔ اس کے بعد اس کے کپڑے نکال کر دھوئے، سوکھائے اور اس کو پہنائے۔ حضرت موسی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے اس بڑھیا کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے تو قریب جاکر کان لگائے۔ میں نے سنا کہ بڑھیا دعا کرتی تھی: اے اللہ میرے بیٹے کو جنّت میں حضرت موسیٰ کا رفیق بنائیو۔ اس کے بعد اس نے اُس زنبیل کو لے کر لٹکا دیا۔ میں نے اس نوجوان سے پوچھا: قصّہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ میری ماں بہت کمزور ہوگئی ہے۔ چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس سے کہا: خوش خبری سُن لے۔ میں اللہ کا نبی موسی ہوں اور تو جنّت میں میرا رفیق ہے۔

سو(۱۰۰)حج کا ثواب۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

مامن ولد بار ينظر نظرة رحمة إلى والديه إلا كتب الله له بكلّ نظره حجة مبرورة۔ (مشکوۃ شریف، کتاب الآداب: 4944)

فرماتے ہیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ بیٹا جو ماں باپ کا فرماں بردار ہو- دیکھو فرماں برداری کی قید کی ہے- ماں باپ کا فرمابردار بیٹا جب اپنے

ماں باپ کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھتا ہےتو اللہ تعالی ہر نظر کے بدلے میں حج مبرور لکھتے ہیں۔

قالو ولو فی کُل یوم مئة مرة۔صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دن میں سو مرتبہ اپنے ماں باپ کو رحمت کی نظر سے دیکھے تو ہر نظر کے بدلے میں اللہ تعالی حج مبرور لکھیں گے؟ فطرتاً یہ سوال پیدا ہوگا ہی۔ کیوں کہ یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی آدمی دن میں سو مرتبہ اس طرح دیکھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ اللہ أکبر و أطیب۔ اللہ بہت بڑا ہے اور پاکیزہ ہے۔ یعنی ہم جیسے انسان تو بہت کم ظرف ہیں، کوئی ایسے انعام کا اعلان کر دیا گیا اور اندیشہ یہ ہوا کہ بہت سارے لوگ لے جائیں گے تو پھر قید لگا دیں گے کہ پہلے دن آنے والوں کو ملے گا۔ بعد والوں کو نہیں ملے گا۔ یہاں تو جتنی مرتبہ دیکھو، یہ ثواب ملے گا۔

حضرت ابن عمرؓ کا واقعہ۔

حدیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کے دوستوں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیا جائے۔ مسلم شریف اور ابوداود شریف میں قصہ موجود ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک سفر میں جارہے تھے، راہ میں ایک دیہاتی ملا، انہوں نے اپنا گدھا اور عمامہ اُس دیہاتی کو دے دیا۔ لوگوں نے کہا: حضرت یہ تو دیہات کا رہنے والا ہے، تھوڑا سا سلوک کرتے تو بھی وہ خوش ہوجاتا، آپ نے سب کچھ دے ڈالا۔ تو کہا: اس کا باپ میرے ابا کا دوست تھا۔

صلہ رحمی کا کم سے کم درجہ

بہر حال رشتہ داروں کے حقوق کے معاملہ میں ہمارے یہاں جو کوتاہیاں کی جاتی ہیں ان کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا زیادہ احساس ہونا چاہیے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا، سلوک اور اچھا معاملہ کرنے میں رسم و رواج کا پابند نہ ہونا چاہیے۔ ان کے درجات میں کوئی کوتاہی نہ ہو، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ دور کا رشتہ دار ہو تو بھی آپ اس کو سلام کریں، اس کے ساتھ تعلق قائم رکھیں۔ آج کل عام طور پر بھائی بھائی میں، اسی طرح بھائی بہنوں میں چچا کے لڑکوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے ایسے ہیں کہ بات تک کی نوبت نہیں آتی اور کٹی رہتی ہے، تعلقات کشیدہ رہتے ہیں، یہ "قطع رحمی" ہے، اور اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اسی سے روزیوں میں بے برکتی ہوتی ہے۔

نیکی کر دریا میں ڈال۔

ایک آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر کہنے لگا کہ اللہ کے رسول! میرے رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرتا ہوں؛ لیکن وہ میرے ساتھ بُرائی کا سلوک کرتے ہیں۔ میں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں مگر وہ میرا حق ضائع کرتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ اچھائی سے پیش آتا ہوں پھر بھی وہ میرے ساتھ بُرائی سے پیش آتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا: کیا ایسا ہی ہے؟ کہا: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تو تو ان کو گرم راکھ کھلا رہا ہے اور اللہ کی طرف سے تیرے

لئے ہر وقت مدد گار فرشتہ ان کے مقابلہ میں مقرر ہے جو تیری مدد کرتا ہے، اور تیرے لئے دعا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بدلہ دیں یا نہ دیں ہمیں صلہ رحمی کرنی ہے، ہم کیوں اُن سے توقع رکھیں؟ ہم تو اللہ سے توقع رکھیں اور اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر بھلائی کا معاملہ کرتے رہیں۔

چوں کہ آپ دوسرے ملک میں رہتے ہیں، یہ مسائل آپ کو بار بار پیش آتے ہیں، اس کی وجہ سے بڑے جھگڑے بھی ہوتے ہیں، اس لیے ان چیزوں کے چکر میں بالکل نہ پڑیں، آپ بھلائی کرتے جائیے۔

ایک مثل مشہور ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ مطلب یہ کہ نیکی کرو اور بھول جاؤ، ہاں! بُرائی کر کے یاد رکھو، اس لیے کہ اس سے توبہ کرنی ہے اور آئندہ بچنا ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ اُلٹا ہے کہ برائی کر کے بھول جاتے ہیں اور نیکی کر کے یاد رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

چند خطابات کا مجموعہ: (۱) پناما (۲) مرکز مسجد (۳) نورانی مسجد ہوڈی بنگلہ سورت۔ 2004-9-3

والدین کی نافرمانی

علماء نے لکھا ہے کہ باپ اگر بیٹے کو کوئی کام کرنے کے لئے کہنا چاہے تو یوں نہ کہے کہ بیٹا یوں کرو، کیوں کہ کسی جائز کام کے متعلق باپ اگر بیٹے کو یوں کہے کہ بیٹا یوں کرو، تو بیٹے پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس پر علماء نے مسئلہ کے طور پر لکھا ہے کہ باپ یوں نہ کہے کہ کرو، یعنی حکم نہ دے؛ بلکہ یوں کہے کہ بیٹا یہ کام ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ تاکہ بیٹے کو یہ معلوم ہو جائے کہ باپ یہ کام کروانا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ نہیں کرے گا تو گنہگار نہ ہوگا اور اگر یوں کہا کہ کرو، اور پھر بھی اس نے نہیں کیا، تو حکم نہ ماننے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔

اَلْحَمْدُ للہ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُبِاللہ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ أَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ أَن لَّااِلٰہَ إِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْ لَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہ، صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ امابعد

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم۔

وَقَضَى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلاً كَرِيماً وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيراً (سورة الإسراء: 24-23)

وعن أبي بكرة، رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول: كل الذنوب يؤخر الله ما شاء منها إلى يوم القيامة إلا عقوق الوالدين فإن الله تعالى يعجله لصاحبه في الحياة قبل الممات (مستدرک علی الصحیحین: 7345)

والدین کے حقوق وآداب

محترم حضرات! گزشتہ دومجلسوں سے صلہ رحمی اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کے سلسلے میں بات چل رہی تھی۔ ابھی آپ کے سامنے قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کی گئی ہے۔ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے:

وقضی ربّک ألا تعبُدُوا إلا إیّاہُ: تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت اور بندگی نہ کرو۔

وبالوالدین احسانا اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی اور اچھائی کا سلوک کرو،

إما یبلغن عندک الکبر أحدھما أو کلاھما: اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بڑھاپے کو پہونچ جائیں تو **فلاتقل لھما أف** ان کو اُف تک نہ کہو

ولاتنھرھما: اور ان کو نہ جھڑکو۔

وقل لھما قولاً کریما: اور ان کے ساتھ ادب والی بات کیا کرو۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر اُف سے بھی کم درجہ کا کوئی گناہ ہوتا تو اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن پاک میں اُس کا ذکر کرکے اُس سے بھی منع فرماتے۔

اُف کرنے سے منع فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ماں باپ کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ یا ایسا سلوک کرنا جس سے اُن کو تکلیف پہنچے یا اُن کی طبیعت پر اثر ہو؛ حتی کہ ان کی طرف سے پیش آنے والی کسی بات یا معاملہ کے جواب میں اس طرح لمبی سانس کھینچنا جس سے اُن کو تکلیف پہنچے؛ یہ سب گناہ ہے۔ اور وہ بھی صغیرہ نہیں، کبیرہ گناہ ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حکم دیتے ہیں: **وقل لھما قولاً کریما:** اُن کے ساتھ ادب کی گفتگو کرو۔ ان کے ساتھ جب بات کی جائے تو آواز بھی پست ہونی چاہیے۔ **واخفض لھما جناح الذل:** یعنی ان کے ساتھ بالکل عاجزی کے ساتھ پیش آؤ، گویا ان کے سامنے جھکے جھکے رہو۔

ماں باپ کا ادب واحترام واجب ہے۔

اس آیت کے متعلق علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تبارک و تعالی نے اپنی عبادت کے ساتھ ماں باپ کے ادب و احترام اور اُن کی راحت رسانی کو واجب قرار دیا ہے۔ یعنی جہاں اللہ تعالی نے اپنی عبادت کا حکم دیا، وہیں ماں باپ کے ادب واحترام کو اسی آیت میں ایک ساتھ جوڑ کر بیان کیا۔ جیسے سورۂ لقمان میں اللہ تبارک وتعالی نے اپنی شکر گذاری کے ساتھ ماں باپ کی شکر گذاری کو جوڑا۔: أن اشکر لی و لوالدیک : میرا شکر ادا کرا اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کرو۔ گویا دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسی لئے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جب تک آدمی ماں باپ کا ادب و احترام نہیں کرتا اور اُن کا شکر ادا نہیں کرتا اس کی عبادت قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ طبرانی کی روایت ہے، نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں:

ثَلَاثَةٌ لَا يَنْفَعُ مَعَهُنَّ عَمَلٌ : الشِّرْكُ بِاللهِ ، وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ ، وَالْفِرَارُ مِنَ الزَّحْفِ (المعجم الکبیر : 1420)

تین گناہ ایسے ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی عمل قبول نہیں۔ ایک اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، دوسرا ماں باپ کی نافرمانی کرنا اور تیسرا میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیرنا۔

ماں کی ناراضگی اور زبان پر کلمہ جاری نہ ہونا۔

مسند احمد میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک صحابی تھے علقمہ نام کے۔ نماز روزے کے

پابند، تہجد کے پابند، موت کا وقت آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ کلمہ زبان پر جاری نہیں ہوتا۔ اُن کی بیوی نے نبیٔ کریم ﷺ پر کہلوایا کہ ان کی زبان پر کلمہ جاری نہیں ہوتا ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے پوچھا کہ اُن کے والدین ہیں؟ کہا: اُن کی ماں ہے اور ناراض ہے۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے بڑھیا پر کہلوایا کہ میں تمہاری ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں آتی ہو یا میں تمہارے پاس آؤں؟ بڑھیا نے جواب میں کہلوایا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں آپ کو کیوں تکلیف دوں، میں ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہوں۔ چنانچہ وہ بڑھیا نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اُس سے پوچھا تو اُس نے بتلایا کہ یہ بیٹا بہت نیک ہے، نماز روزہ کا پابند، تہجد کا پابند، لیکن اپنی بیوی کے مقابلے میں میری ہمیشہ مخالفت کرتا ہے، اس لئے میں ناراض ہوں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ تو اس سے راضی ہوجا اور بیٹے کی خطا معاف کردے۔ اس نے کہا کہ میں معاف نہیں کروں گی۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو حکم دیا کہ اے بلال! لکڑیاں جمع کرو، آگ لگاؤ اور اس کو جلادو۔ بڑھیا یہ سن کر سہم گئی اور کہنے لگی: کیا میرے بیٹے کو جلا دیا جائے گا؟ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مقابلے میں ہمارا عذاب بہت ہلکا ہے۔ خدا کی قسم اگر تو ناراض ہے تو اس کی کوئی نماز اور اس کا کوئی صدقہ اللہ کے یہاں قبول نہیں۔ یہ سُن کر بڑھیا نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کو اور تمام لوگوں کو گواہ بناتی ہوں کہ میں نے اپنے بیٹے کو معاف کردیا۔

اب حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی کو بھیجا کہ جاؤ دیکھو، ان کی زبان پر کلمہ

جاری ہوا یا نہیں؟ چنانچہ لوگ گئے اور آ کر بتلایا کہ اُن کی زبان پر کلمہ جاری ہوا اور کلمہ پڑھتے پڑھتے دنیا سے رخصت ہوئے۔

پھر نبیٔ کریم ﷺ نے ان کے غسل اور کفن کا حکم دیا۔ جنازے میں خود تشریف لے گئے۔ دفن کے بعد آپؐ نے مہاجرین اور انصار کو خطاب کر کے فرمایا کہ جس نے بھی اپنی ماں کی نافرمانی کی تو جب تک کہ وہ توبہ کر کے راضی نہ کر لے اس پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا کوئی فرض اور کوئی نفل قبول نہیں، اور اللہ کی رضا مندی ماں کی رضا مندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی ماں کی ناراضگی میں ہے۔

مشکوۃ شریف میں ایسی روایت حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی بھی ہے۔ جس میں باپ کی تصریح ہے کہ اللہ کی رضا مندی باپ کی رضا مندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ رضا الرب فی رضا الوالد، وسخط الرب فی سخط الوالد، رواہ الترمذی (مشکوۃ شریف، کتاب الآداب، باب البر والصلۃ 4927)

ابھی میں نے حضرت ابوبکرہؓ کی روایت آپ کے سامنے پڑھی تھی، **عن أبي بكرة، رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم يقول: كل الذنوب يؤخر الله ما شاء منها إلى يوم القيامة إلا عقوق الوالدين فإن الله تعالى يعجله لصاحبه في الحياة قبل الممات** (مستدرک علی الصحیحین:7345)

اللہ تعالی جس گناہ کو بھی چاہیں، معاف کر دیتے ہیں یا مؤخر کر دیتے ہیں سوائے ماں باپ کی نافرمانی، کہ موت سے پہلے اُس گناہ کی سزا اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا ہی کے اندر دیا کرتے ہیں۔

اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو۔

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت کہ آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: **رغم أنفه ثم رغم أنفه ثم رغم أنفه قيل من يا رسول الله قال من أدرك والديه عند الكبر أحدهما أو كليهما ثم لم يدخل الجنة** (مسلم شریف، کتاب البر والصلۃ :۲۵۵۱)

اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو، یعنی وہ آدمی ذلیل اور رسوا ہو۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ کون ہے وہ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا، کسی ایک کو یا دونوں کو؛ اور ان کی خدمت کر کے یا ان کے حقوق ادا کر کے جنت میں داخل نہ ہو گیا۔ ایسا آدمی ذلیل ہوا اور رسوا ہو۔

مردے کا منہ اور آواز گدھے جیسی ہو گئی۔

ابن حوشب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ایک بستی میں گیا۔ جس کے کنارے پر ایک قبرستان تھا۔ عصر کی نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ اس میں سے ایک قبر پھٹی اور ایک آدمی نکلا جس کا منہ گدھے کی طرح تھا۔ تین مرتبہ گدھے کی طرح آواز نکالی اور اس کے بعد پھر وہ اس قبر میں گیا اور قبر بند ہو گئی۔ پھر میں نے وہاں ایک بڑھیا کو دیکھا جو اُون کات رہی تھی۔ ایک آدمی نے مجھ سے کہا جانتے ہو یہ بڑھیا کون ہے؟ میں نے کہا۔ مجھے کیا معلوم؟ کہا: یہ اُسی آدمی کی ماں ہے۔ وہ شراب پیا کرتا تھا اور شام کے وقت شراب کے نشہ میں گھر آتا تھا، اس کی ماں کہا کرتی تھی:

بیٹا! کب تک شراب پیتے رہو گے؟ تو اس کے جواب میں وہ کہتا تھا: ارے تو گدھے کی طرح کب تک بولتی رہے گی؟ ایک دن عصر کے بعد اس کا انتقال ہو گیا اور جس روز سے دفن کیا ہے اُس روز سے یہی برابر ہوتا ہے۔ روزانہ عصر کی نماز کے بعد قبر پھٹتی ہے اس میں سے وہ نکلتا ہے۔ گدھے جیسا منہ ہوتا ہے۔ تین مرتبہ اس طرح بولتا ہے پھر واپس چلا جاتا ہے۔ **(الترغیب و الترھیب للمنذری، باب الترھیب من عقوق الوالدین)**

بری موت

ڈاکٹر نور احمد نور کے قصے پہلی مجلس میں کچھ بیان کر چکا ہوں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد صاحب کے ایک دوست تھے، اُن کی ماں قریب المرگ تھی۔ اس ماں کے ساتھ انہوں نے بڑی بدتمیزی کا معاملہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ بیچاری اکیلی مر گئی۔ تین سال کے بعد یہ بیمار ہوئے، دست لگے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ وہ والد صاحب کے دوست تھے، اس لئے اُن کے علاج کے لئے مجھے والد صاحب نے بلایا۔ میں نے ان کو دیکھ کر کوئی غذا تجویز کی کہ یہ غذا استعمال کرائی جائے، تو وہ روتے ہوئے کہنے لگے: میرے تین بیٹے ہیں۔ اتنے دنوں سے بیمار ہوں، ایک نے بھی آ کر میری خبر نہیں پوچھی۔ اسی حالت میں اکیلے اکیلے اُن کا انتقال ہو گیا۔ صبح کے وقت محلے کے لوگوں نے دیکھا کہ جسم پر چونٹیاں چپکی ہوئی ہیں، کاٹ رہی ہیں اور اسی حالت میں موت آئی۔

ماں باپ کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کرنا بڑی خطرناک چیز ہے۔ اور نبئ کریم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اُس کو دنیا ہی میں سزا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ماں باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرتے ہیں، اُن کو اللہ تبارک وتعالیٰ دنیا میں نوازتے ہیں۔

زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔

ایک اور قصہ لکھا ہے کہ میرے ایک دوست ایک گاؤں میں گئے، انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا قصہ بیان کیا کہ وہاں ایک آدمی کی بیوی اور اس کی ماں میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ بار بار بیوی اپنی ماں کے گھر چلی جاتی تھی، وہ منا کر لاتا تھا۔ اخیر میں جب وہ چلی گئ تو بیوی نے کہا کہ میں نہیں آؤں گی ، ہاں تم اگر مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ اپنی ماں کو ختم کر دو گے تو میں آؤں گی۔ وہ بھی تنگ آ گیا تھا، ہاں کہہ دیا۔ بیوی کو لے آیا، اور ماں کو ختم کرنے کے لئے اس نے ایک اسکیم بنائی۔ دوسرے روز جب کھیت میں جانے لگا تو اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گیا۔ کہا کہ گھاس کاٹنی ہے، اس کا گٹھر میرے سر پر چڑھانے کے کام میں آپ مدد کریں گی۔ یہ کہہ کر ساتھ لے گیا۔ وہاں گھاس کا گٹھر تیار کیا، ماں سے کہا کہ اُٹھانے کے لئے آگے آؤ۔ کُلہاڑا پہلے سے تیار رکھا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی ماں کے اوپر کلہاڑے سے حملہ کرنا چاہا تو ایک دم اس کے پاؤں کو زمین نے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے کلہاڑا چھوٹ گیا اور اس کی ماں چلّا کر بھاگی۔ وہ زمین میں دھنستا جا رہا ہے، چلّا رہا ہے اور ماں کو پکار رہا ہے۔ معافی مانگ رہا ہے ،مگر اس کی ماں بھاگ چکی تھی۔ بہت دیر کے بعد لوگوں کو اس کی آواز پہنچی۔ جب لوگ آئے، اس

کے قریب پہنچے تو سینے تک زمین کے اندر جاچکا تھا اور لوگوں نے باہر کھینچنے کی بہت کوشش کی، لیکن لوگوں کے سامنے زمین کے اندر اسی طرح دھنستے ہوئے دفن ہو گیا۔کیسی بُری موت آئی!

یہ ماں باپ کے ساتھ کی جانے والی بدسلوکی کا پھل ہے۔دنیا میں جیسا سلوک کروگے، ویسا ہی پاؤ گے۔

بہرحال ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک بہت اہم چیز ہے۔آج کل اُس کی طرف سے بہت غفلت برتی جاتی ہے۔ضرورت اس کی ہے کہ اس کا اہتمام کیا جائے۔اسی سلسلے میں اور بھی بہت سے واقعات ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے اور ان کی نافرمانی سے بچائے۔

ایسی خراب موت کسی کی نہیں دیکھی

انہوں نے لکھا ہے کہ ایک نوجوان تھا، میں نے اپنی چالیس سالہ ڈاکٹری میں ایسی خراب موت کسی کی نہیں دیکھی۔تین روز تک نزع یعنی سکرات کی کیفیت اس پر رہی۔اس کی کِڈنی فیل ہوگئی تھی، چہرہ نیلا پڑ گیا تھا، آنکھیں باہر نکل آئی تھی، گلے میں سے ایسی آواز آتی تھی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔آخری دن تو ایسی خطرناک آواز ہوگئی کہ اس وارڈ میں جتنے دوسرے مریض تھے، سب بھاگ گئے۔ہم نے اس کو وہاں سے ہٹا دیا اور دور لے گئے۔آخری دن تو اور زیادہ حالت خراب ہوگئی۔اس کا باپ آیا تو باپ بھی دیکھ کر کہنے لگا کہ ڈاکٹر صاحب! زہر کا انجکشن لگا دو، جس سے اس کو موت آجائے۔میں نے اس کے باپ سے

پوچھا کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہے؟ تو اس نے کہا کہ یہ اپنی بیوی کی طرف داری کرتا تھا اور اپنی بیوی کی طرف داری میں اپنی ماں کی پٹائی کرتا تھا۔

بیٹی نے باپ کی پٹائی کی۔

حضرت مولانا ارشد صاحب مدنی دامت برکاتہم نے قصہ سنایا اور ان کی زبان سے میں نے خود بھی سنا ہے کہ دیو بند کا ایک دُکاندار تھا، اُس نے دوسرے ایک دُکان دار کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ دیکھو! سامنے یہ بُوڑھا جو دُکان پر ہے وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا باپ دُکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ یہ آیا اور اس نے باپ کو پکڑ کر نیچے گرایا، نالی میں ڈالا اور اس کی پٹائی کی، اس کے بعد اس کی شادی ہوئی، اس کا باپ تو انتقال کر گیا تھا۔ اس کے یہاں چار لڑکیاں ہوئیں، لڑکا ایک بھی نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ علماء سے میں نے سُنا ہے کہ جو آدمی باپ کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے تو جیسا معاملہ کرتا ہے ویسا ہی اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی لڑکا تو ہے نہیں، پھر یہ کیسے ہوگا؟ ایک روز ایسا ہوا کہ میں دُکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی لڑکی برقعہ پہن کر آئی اور اس نے اپنے باپ کو نیچے گرایا اور نالی میں ڈالا اور بالکل اسی طرح اس کی پٹائی کی جیسی اُس نے اپنے باپ کی کی تھی۔

میں بھی ابا کو اسی طرح لایا تھا۔

حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ نے معرفت الٰہیہ میں قصہ لکھا ہے اور ابوعلی محسن التنوخی کی کتاب نُشْوَارُ الْمُحَاضَرة میں بھی میں نے پڑھا کہ کوفہ میں ایک بیٹے

نے باپ کی ٹانگ کو رسّی سے باندھا، اور کھینچ کر مکان سے باہر دور لے گیا۔ ایک جگہ جب پہنچا تو باپ بیٹے سے کہتا ہے: بیٹا! بس اب اگر اس سے آگے لے جائے گا تو تو ظالم بنے گا۔ تو بیٹا کہتا ہے کہ ابا جان! اب تک میں ظالم نہیں تھا؟ تو کہا: نہیں! میں بھی اپنے ابّا کو اسی طرح ٹانگ باندھ کر یہاں تک لایا تھا۔ (نشوار المحاضرۃ: ۲-۲۰۱، بیروت) تو بھائیو! ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی آج بڑھ گئی ہے ،اس لیے اس سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔

حقوق سب کے ہیں۔

ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ماں باپ کی وجہ سے بیویوں پر ظلم و زیادتی کی جائے۔ حضرت تھانویؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے 'تعدیل حقوق الوالدین' اور بہشتی زیور کے نویں حصہ میں ضمیمہ کے طور پر اس کو شامل کیا ہے۔ اس لیے ماں کی وجہ سے بیوی پر زیادتی بھی نہیں کرنی ہے اور اس کے حقوق بھی ضائع نہیں کرنے ہیں۔ شریعت نے سب کے حقوق رکھے ہیں۔ سب کے ساتھ برابری کا معاملہ ہونا چاہیئے۔ ماں باپ کا تو اتنا زیادہ حق ہے جس کی کوئی انتہا نہیں **فَلاَ تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَ لاَ تَنْهَرْهُمَا** ان کو اُفّ تک نہ کہو، یعنی ایسا لفظ جس کی وجہ سے ان کو تکلیف پہنچے وہ بھی نہ کہو؛ تو پھر جھڑکنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ بلکہ ماں باپ کی تو مکمل فرماں برداری ضروری ہے۔

باپ اپنے بیٹے کو کس طرح حکم دے؟

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ باپ اگر بیٹے کو کوئی کام کرنے کے لئے کہنا چاہے

تو یوں نہ کہے کہ بیٹا یوں کرو، کیوں کہ کسی جائز کام کے متعلق باپ اگر بیٹے کو یوں کہے کہ بیٹا یوں کرو، تو بیٹے پر وہ کام کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس پر علماء نے مسئلہ کے طور پر لکھا ہے کہ باپ یوں نہ کہے کہ کرو، یعنی حکم نہ دے؛ بلکہ یوں کہے کہ بیٹا یہ کام ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ تا کہ بیٹے کو یہ معلوم ہو جائے کہ باپ یہ کام کروانا چاہتا ہے۔ اب اگر وہ نہیں کرے گا تو گنہگار نہ ہوگا۔ اور اگر یوں کہا کہ کرو، اور پھر بھی اس نے نہیں کیا، تو حکم نہ ماننے کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا۔

ظالم والدین کی بھی اطاعت۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے بیہقی کی شعب الایمان کے حوالے سے نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، جو آدمی اللہ کے واسطے اپنے ماں باپ کی اطاعت اور فرماں برداری کرتا ہے اُس کے لئے جنّت کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور جو آدمی اُن کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے لئے جہنّم کے دو دروازے کھل جاتے ہیں اور ان میں سے اگر ایک موجود اور زندہ ہے اور اس کی اطاعت کرے تو جنّت کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور اگر اُس کی نافرمانی کرے تو جہنم کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ جہنم کے دروازے کھلنے کی جو آپ نے وعید سنائی، کیا اگر ماں باپ کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہو تو بھی۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: **وإن ظلما وإن ظلما وإن ظلما**۔ چاہے ماں باپ کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہو، چاہے ماں باپ کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہو، چاہے ماں باپ کی طرف سے ظلم اور زیادتی ہو۔ پھر بھی یہ وعید اُس کے لئے ہے۔ (معارف القرآن: ۵، ۴۶۴۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں باپ کی طرف سے کوئی بھی معاملہ ہو، اولاد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اُن کے اس معاملہ کی وجہ سے اطاعت، فرمابرداری اور خدمت میں جو ان کا حق ہے اُس سے ہاتھ کھینچ لے اور انتقام لے۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لئے اس کا خاص اہتمام کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کی قدر و قیمت کی توفیق عطا فرمائیں اور ان کے حقوق کو ضائع کرنے سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تواصی بالحق والصبر اورتبلیغ کی محنت

موت کے وقت کہی جانے والی باتوں کو وصیت کہتے ہیں۔

موت کی گھڑی دلوں پر خاص اثر ڈالنے والی ہوتی ہے،کسی پر موت آرہی ہے تواس مجلس میں جتنے موجود ہوتے ہیں ہرایک کے دل پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے؛ چنانچہ اس وقت مرنے والا جو بات کرتا ہے وہ اپنے اندر خاص اثر رکھتی ہے اور مرنے والا بھی بڑی اہمیت اور تاکید کے ساتھ اس بات کو بیان کرتا ہے،اس لیے اس کو وصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ورنہ عربی زبان میں وصیت ہراس بات کو کہتے ہیں جو اہمیت کے ساتھ،مؤثر انداز میں کسی کے سامنے پیش کی جائے۔

رانی تالاب مرکز 16-06-2000

عنوانات

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه و نعوذبالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له، ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و نشهد أن سيدنا و مولانا محمدا عبده ورسوله۔

صلى الله تعالى عليه و على آله و أصحابه و بارک و سلم تسليماً كثيراً كثيراً۔

أما بعد۔ فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم۔ بسم الله الرحمن الرحيم۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلاَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

محترم حضرات!

قرآن پاک کی ایک چھوٹی سی سورت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے۔ چھوٹے ہونے کے باوجود اپنے اس مضمون کی وجہ سے جس کی اس میں تعلیم دی گئی ہے، یہ سورت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں اگر کوئی آدمی اس طرح کی ایک ہی سورت میں غور وفکر کرلے تو وہ اس کی ہدایت کی لیے کافی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ دو صحابی جب آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے کو یہ سورت پڑھ کر سنائے بغیر دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے۔ (معجم اوسط، طبرانی، ۵۲۶۶) گویا اس سورت میں جس درس اور سبق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، اس کو وہ ہر ملاقات میں تازہ کیا کرتے تھے۔

اس سورت میں باری تعالی نے زمانے کی قسم کھائی ہے، والعصر، قسم ہے

زمانہ کی۔ **إن الانسان لفی خسر**۔ کہ نوع انسانیت خسارے میں ہے۔**إلا الذین آمنوا**۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق کی وصیت اور تاکید کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہے؛ وہ البتہ خسارے میں نہیں۔

اللہ تبارک وتعالی کی قَسمیں:

یہاں خاص طور پر اللہ تبارک وتعالی نے جو مضمون آگے بیان کیا گیا ہے، اس مضمون کی شہادت کے طور پر زمانہ کی قسم کھائی ہے۔

اللہ تعالی تبارک وتعالی کی جو قَسمیں قرآن پاک میں ہیں ان کا وہ حال نہیں جو انسان کے کلام میں اس کی قسموں کا ہوتا ہے؛ بلکہ اللہ تبارک وتعالی قرآن پاک میں جہاں کسی مضمون کے متعلق اور کسی ہدایت کے متعلق قسم کھاتے ہیں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے آپ اس میں غور کریں تو جو بات قسم اٹھا کر آگے بیان کی جارہی ہے، اس کی صداقت کا پتہ چل جائے گا اور قسم کو گویا اس پر ایک شاہد اور گواہ کے طور پیش کیا جارہا ہے۔

زمانہ کی قسم، ایک شہادت ہے۔

زمانہ کی قسم اس لیے کھائی گئی کہ انسان کی پیدائش اور اس کے مختلف حالات کا تعلق زمانہ سے ہے۔ جب سے یہ کائنات وجود میں آئی اور یہ انسانی تاریخ جب سے لوگوں کے علم میں آئی اور ترتیب دی گئی، اس وقت سے اگر آپ پوری تاریخ

انسانی کا اور جن مختلف ادوار سے اور زمانوں سے وہ گذری ہے اس کا آپ مطالعہ کریں، اور جائزہ لیں تو آپ کو انسانی تاریخ یہ بتلائے گی کہ اس پوری تاریخِ انسانی میں جتنے بھی لوگ گذرے ہیں اور جن کا بھی تعلق نوع انسانی سے رہا ہے وہ سب گھاٹے میں رہے ہیں، سوائے ان حضرات کے جو ان چار صفتوں سے اور ان چار خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ البتہ کامیاب رہے اور ان کے علاوہ باقی سارے انسان خسارے اور گھاٹے میں رہے۔

یہاں پوری انسانیت کی تاریخ کو اللہ تبارک وتعالی نے ایک گواہ بنا کر پیش کیا ہے کہ اس کے مختلف ادوار پر اگر آپ کی ناقدانہ نظر ہو اور آپ اچھی طرح اس کا مطالعہ کریں تو آگے جو بات بیان کی جارہی ہے اس کا خود بخود یقین ہو جائے گا اور اس کی صداقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو کر آپ کے سامنے آجائے گی۔

زندگی کا سرمایہ

یہاں زمانہ کو خاص طور پر پیش کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو دنیا میں بھیجا گیا تو دنیا میں آکر اپنا کام کرنے کے لیے اور اپنی تجارت کے لیے اور اپنے کاروبار کو چلانے کے لیے اس کو سرمایہ دیا گیا، پونجی دی گئی۔ اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے دی گئی یہ پونجی اور سرمایہ؛ اس کی زندگی اور عمر کے اوقات ہیں۔

بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کیا لے کر آتا ہے؟

اللہ تبارک وتعالی نے اس کے لیے جس قدر زندگی مقدر فرمائی ہو اور جتنا قیام اس کے لیے طے شدہ ہوتا ہے وہ اس کا سرمایہ ہے، یعنی زندگی کے اوقات، سال،

مہینے، ہفتے، دن، رات اور گھڑیاں؛ یہی اس کا سرمایہ اور پونجی ہے۔اس کے پاس اس کے علاوہ کچھ نہیں۔اور ایک جسم ہوتا ہے جو اللہ تعالی اسے عطا فرماتے ہیں۔

دنیا میں جو بھی آتا ہے اس کے لیے اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے اور اس مقررہ وقت تک اس کو دنیا میں رہنا ہے اور یہی مقررہ وقت اس کی زندگی کہلاتی ہے۔یہی اس کا سرمایہ ہے اور وہ جو کچھ بھی حاصل کرسکتا ہے وہ اسی سرمایہ کے ذریعہ حاصل کرسکتا ہے۔یہاں آنے کے بعد اپنے اسی جسم کو کام پر لگائے گا اور اسی وقت سے فائدہ اٹھائے گا تو وہ بہت کچھ دنیا اور آخرت کا نفع حاصل کرسکتا ہے اور اگر اپنی زندگی کے اس سرمایہ کو اس نے یوں ہی گنوادیا ضائع کردیا، اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تو اتنا ہی نہیں کہ یہ پونجی اس کے ہاتھ سے چلی جائے گی؛ بلکہ وہ بہت سارے جرائم اور بہت سارے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لے کر دنیا سے جائے گا اور اس کا عذاب آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔خلاصہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے عطا کردہ یہ زندگی ہی وہ قیمتی سرمایہ ہے جس کے ذریعہ وہ جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہے حاصل کرسکتا ہے۔

کتاب الرقاق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر اس کی طرف متوجہ کیا ہے کہ انسان کو زندگی کے اس سرمایہ سے اور اللہ تبارک وتعالی نے فرصت کے جو لمحات عطا فرمائے ہیں ان لمحات میں اپنے بدن سے اور اپنے بدن کی صحت اور قوت سے جو فائدہ حاصل کرنا چاہیے اس سے غفلت نہ برتے۔

محدثین کے یہاں حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل عنوان 'کتاب الرقاق' کا آتا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کے وہ ارشادات جن کو سن کر آدمی کا دل نرم ہوجائے، دنیا کی طرف سے سرد ہوجائے اور آخرت کی طرف رغبت اور میلان اس میں پیدا ہوجائے، گویا دنیا کی محبت کم کرنے والی باتیں اور نبی کریم ﷺ کے ایسے ارشادات کو حضرات محدثین، اپنی کتابوں میں کتاب الرقاق کے عنوان کے ماتحت ذکر فرماتے ہیں۔

کیوں کہ ہماری جو بنیادی بیماری ہے وہ یہی دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت ہے، پس اگر ایسی باتیں پیش کی جائیں جن کے نتیجہ میں دنیا کی محبت کم ہو اور آخرت کی رغبت بڑھے، تو یہ حالت انسان کے لیے کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔

وقت اور صحت مند جسم کی نعمت

چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب بخاری شریف میں کتاب الرقاق کو نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات سے خاص طور پر شروع کیا جن میں وقت اور جسم کی نعمت کا ذکر ہے۔ اور پہلی ہی روایت یہ ہے کہ: **نعمتان مغبون فیهما کثیر من الناس، الصحة والفراغ۔**

اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے معاملہ میں اور ان نعمتوں کی حقیقی قدر و قیمت وصول کرنے کے معاملہ میں لوگ بہت گھاٹے میں ہیں، وہ دو نعمتیں کیا ہیں: ایک ہے فرصت اور دوسری ہے تندرستی۔

اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اگر انسانیت کا اور نوع انسانی کا مطالعہ کریں تو دنیا میں عام طور پر لوگ ایسے نظر آئیں گے کہ اللہ کی ان دو عظیم نعمتوں کا جیسا فائدہ اٹھانا چاہیے، اس طرح ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے؛ بلکہ اس معاملہ میں گھاٹے، خسارے اور نقصان کا شکار ہیں۔

اس لیے اللہ تبارک تعالی نے انسان کو زندگی کا جو موقع عطا فرمایا ہے اور فرصت کے لمحات کی جس نعمت سے نواز ہے؛ اس سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے اور اس کی قیمت وصول کرنی چاہیے اسی طرح جسمانی تندرستی کی نعمت سے کام لے کر بہت زیادہ اس کی قیمت وصول کرنی چاہیے۔

جو بات قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالی نے فرمائی :**إن الانسان لفی خسر**، میں کہ انسان گھاٹے اور خسارے میں ہے، اسی کی نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرمائی ہے کہ وہ کون سی چیز میں گھاٹا اٹھا رہا ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کی یہ جو دو نعمتیں ہیں تندرستی اور فرصت، اس کا جو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس کی جو قیمت آدمی کو حاصل کرنی چاہیے، اس قیمت کے پانے اور حاصل کرنے کے معاملہ میں آدمی گھاٹے اور خسارے میں ہے۔

کس طرح گھاٹے اور خسارے میں ہے؟

ہر تاجر جانتا ہے کہ اس کے پاس موجود سرمایہ اور مال کی جو ویلیو ہے اور بازار سے جو زیادہ سے زیادہ متوقع قیمت حاصل کی جا سکتی ہے، اس متوقع قیمت سے کم قیمت اگر وہ پاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ جتنا اس کو فائدہ اٹھانا چاہیے تھا اور جتنی قیمت

اپنے سرمایہ سے وصول کرنی چاہیے تھی؛ وہ قیمت اس نے وصول نہیں کی، اس لیے وہ گھاٹے میں ہے۔

آپ کپڑے کا ایک تھان لائے ہیں یا آپ کے پاس موجود ہے اور بازار کے ویلوئیشن کے حساب سے یہ کپڑے کا تھان ایک ہزار کی قیمت کا ہے۔ اگر آپ اس کپڑے کے تھان کو فروخت کر کے ایک ہزار سے زیادہ وصول کرتے ہیں اور پاتے ہیں، یعنی ایسا سودا کرتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں ایک ہزار یا اس سے زیادہ آتے ہیں تو یوں کہا جائے گا کہ آپ گھاٹے اور خسارے میں نہیں؛ لیکن اگر آپ اس کپڑے کے تھان کو کسی کے ہاتھ فروخت کر کے اور سودا کر کے جو پیسے وصول کر رہے ہیں وہ ایک ہزار نہیں، بلکہ ایک ہزار سے کم ہے یا ویسے ہی بلا قیمت آپ کے ہاتھ سے وہ کپڑے کا تھان نکل گیا، تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا معاملہ اور سودا گھاٹے اور خسارے کا ہے۔

آخرت کی تجارت

جیسے دنیا کی تجارت ہوتی ہے، اسی طرح آخرت کی تجارت ہے۔ قرآن میں آخرت کے اعمال کو بھی تجارت سے تعبیر کیا گیا: **هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيْمٍ، تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ**

باری تعالیٰ فرماتے ہیں، کیا ایسی تجارت کی نشان دہی کروں؟ جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دینے والی ہو۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اللہ کے

راستہ میں اپنی جان اور اپنے مال کے ذریعہ مجاہدہ کرو، اس کی قربانی دو، مشقت اٹھاؤ۔ جہاد کرو۔

دیکھئے، قرآن میں اس کو تجارت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اللہ تعالی نے انسان کو جو سرمایہ عطا فرمایا ہے اگر وہ آخرت کی ان شکلوں میں یعنی ایمان اور عمل صالح میں لگاتا ہے اور اللہ کے راستہ میں محنت کر کے مختلف طریقوں سے اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے اس سرمایہ یعنی اپنی جان اور اپنے مال کو استعمال کرتا ہے تو اس صورت میں وہ اپنے سرمایہ کو ایک نفع بخش تجارت میں لگا کر اس کی قیمت وصول کرتا ہے۔ اسی کو تجارت سے تعبیر فرمایا۔

حدیث میں بھی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **كل الناس يغدو، فبائع نفسه فمعتقها أو موبقها، أو كما قال عليه الصلاة والسلام** ۔ (مسلم شریف، ۲۲۳، کتاب الطہارۃ، باب فضل الوضوء)

ہر صبح کو جب آدمی نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے، اور یا تو وہ اپنے اس سودے میں کامیابی حاصل کرتا ہے یعنی اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے نجات دلا کر جنت کی نعمت حاصل کرتا ہے یا ایک سودا گھاٹے کا اس طرح کر لیتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو ہلاک و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

تو قرآن و حدیث میں بھی آخرت کے اعمال کے لیے گھاٹے، نفع اور تجارت کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ الفاظ فقط دنیا کی تجارت کے ساتھ مخصوص نہیں۔

گویا نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ ہمیں خاص طور پر متوجہ کیا کہ اللہ تبارک وتعالی نے وقت کی جو نعمت عطا فرمائی ہے، اور زندگی کے جو قیمتی لمحات ہمارے ہاتھ میں دیے ہیں، اور اس کے ساتھ ساتھ صحت کی جو دوسری نعمت عطا فرما رکھی ہے، تم ان دونوں نعمتوں کی اور اپنے اس سرمایہ کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

سرمایۂ حیات کی قیمت کیسے وصول کریں گے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے زندگی کی شکل میں دیا گیا یہ سرمایہ سیال سرمایہ ہے، جامد نہیں۔

آدمی کا ایک سرمایہ وہ ہوتا ہے جسے آدمی اپنی مرضی سے جب چاہے استعمال کرے۔ ابھی استعمال کرنے کا ارادہ نہیں تو محفوظ کر لے۔ مثلاً آپ کے پاس پچاس ہزار روپیے کا سرمایہ موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آج ہی اس کو تجارت میں لگا کر فائدہ اٹھائیں اور اگر آپ چاہیں تو اس کو محفوظ طریقہ سے تجوری میں یا کسی کے پاس امانت کے طور پر یا اور کہیں حفاظت سے رکھ دیں، آج نہیں تو کل، اس سال نہیں تو آئندہ سال، آپ اپنے اس سرمایہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ ایسا سرمایہ ہے جس کو استعمال کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔

دوسری قسم کا سرمایہ وہ ہوتا ہے، جو آپ کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے، اگر آپ دانش مندی اور عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ہاتھ سے نکلنے والے اس سرمایہ سے فائدہ اٹھالیں، اور اس کا کوئی ایسا معاوضہ اور ایسا بدل اپنی مٹھی میں کرلیں جس

کو آپ آئندہ بھی محفوظ رکھ سکیں تو آپ کامیاب ہیں، اور اگر آپ کے ہاتھ سے نکل جانے والے اس سرمایہ کا کوئی ایسا معاوضہ اور بدل جس کو آپ محفوظ رکھ سکیں؛ آپ حاصل نہیں کرتے، تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا یہ سرمایہ آپ کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور بے کار جا رہا ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم

ایک بزرگ گذر رہے تھے، دیکھا کہ ایک آدمی برف بیچ رہا ہے، اس کو دیکھ کر کہنے لگے کہ دیکھو، اس برف بیچنے والے کی تجارت سے مجھے پتہ چل گیا کہ زندگی کا حال کیا ہے۔ برف بیچنے والا کھلے میدان میں، دھوپ کی تیزی کی حالت میں برف لے کر بیٹھا ہے تو ظاہر ہے کہ برف پگھل رہی ہوگی۔ اب یہ شخص جتنا جلدی اس کو بیچ کر اس کے بدلے میں پیسے حاصل کر کے جیب میں رکھ لے اتنا کامیاب۔

اور اگر وہ برف کھلی چھوڑ کر کوئی تماشا دائیں بائیں ہو رہا ہے اس کو دیکھنے میں مشغول ہو گیا، یہاں تک کہ شام ہو گئی، بدلیاں آ گئیں اور بارش بھی ہو گئی۔ دو پہر سے اب تک برف مسلسل پگھل رہی تھی، تھوڑی سی برف رہ گئی تھی مگر شام کو بارش جو آ گئی، تو اس کی بھی کوئی قیمت دینے والا نہ رہا؛ کیوں کہ لوگوں کو اس کی ضرورت نہ رہی؛ تو اس کا سرمایہ یوں ہی ضائع ہو گیا۔

وہ جتنی مستعدی دکھلا کر، ہوشیاری اور عقلمندی سے کام لے کر جلدی سے جلدی اس کو فروخت کر دیتا تو جو برف پگھل رہی تھی، اس کا معاوضہ ایسی شکل میں حاصل کر سکتا تھا کہ جو پگھلنے والا نہ ہو، یعنی روپیے پیسے بنا لیتا تو یہ نوٹ اور سکے پگھلنے

والے نہیں۔

اسی طرح ہماری زندگی کا یہ سرمایہ جو اللہ تبارک وتعالی نے ہم کو عطا فرمایا ہے سالوں، مہینوں، دنوں کی شکل میں؛ وہ حقیقت میں ایک بہنے والا سرمایہ ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم، رفتہ رفتہ چپکے چپکے دم بدم

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ فرماتے ہیں: کہ ہماری زندگی کے یہ لمحات پگھل رہے ہیں۔

آپ یہاں بیٹھے ہیں، میں اور آپ یہ چاہیں کہ ہم اپنی زندگی کے گذرنے والے اس وقت کو روک لیں اور بند کر دیں کہ آگے نہ بڑھنے پائے یا ہم چاہیں کہ ابھی ہم سو رہے ہیں، کچھ کام نہیں کر رہے ہیں، لہٰذا جتنی دیر ہم سوئیں گے اتنی دیر ہماری زندگی کے یہ اوقات فریج (Freeze) ہو جائیں، جمع کر کے رکھ دیں، یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔ ہم کچھ کریں یا نہ کریں، زندگی تو گذر رہی ہے، اللہ تعالی کا دیا ہوا زندگی کا یہ سرمایہ ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ اب اگر ہم گذرنے والے ان اوقات کو ایسی چیزوں میں استعمال کریں، ایسے کام میں لگائیں جس کا کوئی اچھا معاوضہ ہم کو مل جائے، جس کی ہم اچھی قیمت وصول کر لیں، برف بیچنے والا برف بیچ کر کے روپئے اور سکے حاصل کر کے اپنی جیب اور اپنی تجوری میں محفوظ کر لیتا ہے اسی طرح ہم اپنی زندگی کے ان اوقات کو، ان گھڑیوں، ساعتوں، منٹوں اور گھنٹوں کو مفید کاموں میں استعمال کر کے کارآمد بنائیں اور معاوضہ وصول کر لیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کی قیمت وصول کر لی۔

وقت کی دنیاوی قیمت بہت حقیر ہے۔

ویسے دنیوی اعتبار سے ہم وقت کی صحیح قیمت وصول کرتے ہیں۔ دنیا میں جو لوگ نوکری کرتے ہیں، ملازمت کرتے ہیں، دنیوی ساز وسامان کی تجارت کرتے ہیں، فیکٹری چلاتے ہیں یا اور جو کچھ کام کرتے ہیں، وہ سب اپنے اوقات کو لگا رہے ہیں اور اپنے وقت کی قیمت وصول کرتے ہیں۔

ایک ملازم ملازمت کر کے اپنے وقت کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ایک تاجر تجارت کر کے اپنے وقت کی قیمت وصول کرتا ہے۔ ایک فیکٹری کا مالک فیکٹری کے ذریعہ پیداوار کر کے اپنے اوقات کی اور زندگی کی قیمت وصول کرتا ہے۔ دنیوی اعتبار سے جتنے بھی لوگ محنت کرتے ہیں اور دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں، وہ حقیقت میں اپنے اوقات کی قیمت وصول کرتے ہیں؛ لیکن آپ بتلائیے، کوئی زیادہ سے زیادہ کمانے والا، روزانہ کے حساب سے ایک لاکھ کی کمائی بھی کر لیتا ہے تو کتنی کمائی کرے گا آخر؟

روزانہ کا ایک لاکھ کا منافع ہے، تو آپ اس کی زندگی کے تیس یا پچاس سال کے جو مہینہ، دن اور سال ہیں، ان کا حساب لگا کر بتلائیے، وہ کتنا کمائے گا۔ کروڑوں کمائے گا، یا اربوں کے حساب سے کمائے گا؛ لیکن کروڑ ہا کروڑ اور اربہا ارب اس نے جو جمع کیے ہیں؛ آخر اس کے ذریعہ سے وہ کیا حاصل کر سکتا ہے؟ کتنا حاصل کر سکتا ہے؟

اس کے لیے میں ہمیشہ مثال دیا کرتا ہوں کہ دیکھئے! اس پوری دنیا کے نقشہ

میں آپ ہندوستان کو دیکھ لیجئے، کتنا چھوٹا ہے؟ پوری دنیا کے نقشہ میں ہندوستان کی کیا حیثیت ہے؟ اس ہندوستان میں آپ گجرات، اور گجرات میں پھر سورت شہر دیکھیں۔ کیا یہ زندگی کی کروڑہا اور اربہا کی کمائی سے پورا سورت خرید سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ پوری زندگی کتنا ہی اس نے کمایا ہو؟ آپ خود بتلا سکتے ہیں کوئی شخص دنیا میں ایسا نہیں کہ وہ یہ کہہ سکے کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں پورا سورت خرید لوں۔

پورے سورت کو خریدنے کی بات تو بہت بڑی بات ہے۔ اس رانی تالاب کے علاقہ میں چار پانچ محلے اور پانچ چھ گلیا ہیں۔ ان میں جو مکانات اور جو زمینیں ہیں، ان کی قیمت جس قدر بھی ہو، آج کی اس مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں کوئی ایسا آدمی آپ بتلا دیں، جس نے سب سے زیادہ کمایا ہو اور اس کے پاس اتنی دولت موجود ہو کہ وہ اس رقم سے ان پانچ چھ گلیوں کو خرید سکے؟

ہم نے اپنی زندگی کے ان قیمتی لمحات سے جو دولت حاصل کی ہے اس دولت کے متعلق ہم اپنے طور پر یہ خوش فہمی لیے بیٹھے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ کما لیا، مگر ہمارے بہت کچھ کمائے ہوئے کی حیثیت اتنی ہے کہ رانی تالاب کا چھوٹا سا ایریا اور اس کی دو چار گلیاں خریدنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے یوں کہا جا سکتا ہے کہ واقعۃً ہم نے اپنی زندگی کے ان لمحات کو اور اس قیمتی سرمایہ کو گنوا دیا ہے۔

سرمایہ حیات کا اخروی سودا

اس کے بجائے اگر ہم یہی سرمایہ آخرت کے لے استعمال کرتے تو؟

میں اور آپ یا میں جن لوگوں سے خطاب کر رہا ہوں وہ سب؛ اہل ایمان ہیں، ہمارا اور آپ کا قرآنِ پاک پر اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات پر ایمان ہے۔ فضائل ذکر میں آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ نبی کریم ﷺ جب معراج میں تشریف لے گئے تو سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ اپنی امت کو میرا سلام کہیے، پھر ان سے کہیے کہ جنت تو چٹیل میدان ہے، اور **سبحان اللہ، الحمد للہ، لا إله إلا الل، اللہ اکبر**؛ یہ جنت کے درخت ہیں۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایک نسخہ بتلایا ہے کہ ہم ایک مرتبہ سبحان اللہ بولیں گے تو جنت میں ہمارے لیے درخت لگ جائے گا۔

آج کی اس مجلس میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگ وہ بھی ہیں، جو فارمنگ اور کھیتی باڑی کرتے ہیں، ان کو معلوم ہوگا کہ اگر آم کا باغ کوئی تیار کرنا چاہے، جس میں قلمی آم کے پانچ سو درخت ہوں، تو سچ سچ بتایئے اس کے لیے کتنا سرمایہ، کتنے پیسے، کتنی محنت، کتنی توجہ اور وقت درکار ہے؟ اور کتنی مدت کے بعد وہ باغ تیار ہو سکے گا؟

اس کو چاہیے کہ پہلے مناسب زمین خریدے، قلمیں حاصل کرے، کھاد لائے، ملازم کا، پانی کا، حفاظت کا انتظام کرے۔ اور اخرکار بہت کچھ محنت کے بعد بھی یقیناً کچھ معلوم نہیں کب تیار ہوگا؟ خدانخواستہ یہ منصوبہ اس درمیان میں کسی حادثہ کا شکار ہوگیا یا کوئی آسمانی آفت آگئی تو ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔

یہ تو دنیوی اعتبار سے پانچ سو درخت کے ایک باغ کا حال ہے، گویا ہمارے

لیے اس کو تیار کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ آدمی کو ساری زندگی اس میں کھپا دینی پڑتی ہے۔ اور دنیا کے ان درختوں کا حال ہم اور آپ جانتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ پھلتے بھی ہیں یا نہیں؟ اور پھلنے کے بعد ہمارے بھی کام کے ہیں یا نہیں؟ ہم نے محنت کی مگر ہوسکتا ہے کہ اس کے پھل آنے سے پہلے ہم دنیا سے رخصت ہو جائیں اور ہم اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

آخرت کے باغ کی شجرکاری

لیکن آخرت کا معاملہ الگ ہے۔ اس کے لیے نبی کریم ﷺ ہمیں بہت آسان نسخہ بتلاتے ہیں کہ انسان بس سبحان اللہ کہہ دے۔ ادھر زبان سے سبحان اللہ کا بول نکلا اور ادھر جنت میں درخت لگ گیا۔ اور اس درخت کا حال کیا ہوگا؟ وہ کتنا قیمتی ہوگا؟ وہ بھی سن لیجیے۔ اس کا حال دنیوی درخت کا سا نہیں ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے تھے۔ نماز کے دوران آپ ﷺ کچھ آگے بڑھے، کچھ پیچھے ہٹے۔ یعنی کچھ عجیب وغریب حالات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نماز کے دوران پیش آئے۔ نماز سے جب فارغ ہوئے تو حضرات صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آج تو نماز کے دوران آپ پر کچھ ایسی عجیب کیفیتیں طاری ہوئیں کہ اس سے پہلے دیکھنے کو نہیں ملی۔

حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس نماز کے دوران اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے سامنے جنت کو پیش کیا، جہنم کو بھی پیش کیا۔ اور میں نے جنت کا بھی

نظارہ کیا، جہنم کا خطرناک منظر بھی دیکھا۔ جب جنت میرے سامنے لائی گئی تو میں نے چاہا کہ جنت سے انگور کا ایک خوشہ توڑ لوں، اسی لیے میں نے ہاتھ بڑھایا تھا اور اگر میں توڑ لیتا تو تم لوگ قیامت تک اس کو کھاتے رہتے تو بھی وہ ختم نہ ہوتا۔

کیوں ختم نہ ہوتا؟ اس لیے کہ جنت کی نعمت فنا ہونے والی نہیں۔ ایک دانہ توڑا نہیں کہ آٹو میٹک، خودبخود دوسرا دانہ وہاں پیدا ہوجاتا۔ پوری امت قیامت تک اگر اس خوشے کو کھاتی تو بھی ختم نہ ہوتا۔

جنت کے ایک خوشے کا یہ حال ہے تو جنت کے ایک درخت کا حال کیا ہوگا؟

ایک منٹ میں ہم ۷۰ مرتبہ سبحان اللہ آسانی سے پڑھ سکتے ہیں، گویا ایک منٹ میں جنت کے ۷۰ درخت آسانی سے لگوا سکتے ہیں، اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو سوچئے کہ ہم نے اپنی زندگی کے ایک منٹ سے کتنا بڑا فائدہ اٹھایا۔

کیا دنیوی اعتبار سے ہم ایک منٹ کی اتنی قیمت وصول کر سکتے ہیں؟

اب بھی اگر ہم اپنی توجہ اور اپنا دھیان آخرت کی بجائے دنیا میں لگاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو دنیا کے لیے استعمال کرتے ہیں تو سچ بتائیے کہ ہمارا یہ سودا گھاٹے اور نقصان کا سودا ہے یا نہیں؟

اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کی یہ دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اس کی جتنی قیمت وصول کرنی چاہیے، لوگ اس قدر وصول نہیں کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اسی کو قرآن پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ **إن الإنسان لفي خسر** ۔ کہ بنی نوع انسان گھاٹے میں ہے۔

نجات یافتہ گروہ

البتہ اگر کوئی خود کو اس گھاٹے سے، خسارے اور نقصان سے نکالنا چاہتا ہے تو اس کی تدبیر اور طریقہ یہ ہے کہ: **إلا الذين آمنوا وعملوا الصالحات۔**

البتہ جنہوں نے ایمان لا کر اور اعمال صالحہ کا اہتمام کر کے اپنی حالت سدھار لی، اپنی اصلاح کر لی اور اپنا حال ٹھیک کر لیا۔

وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر پھر ایک دوسرے کو حق کی تاکید اور وصیت کرتے رہے۔

تواصی اور وصیت

تواصی مؤثر انداز میں بڑی تاکید کے ساتھ کسی کو نصیحت کرنے کو کہتے ہیں۔

اسی لیے موت کے وقت کہی جانے والی باتوں کو وصیت کہتے ہیں۔ ویسے بھی موت کی گھڑی دلوں پر خاص اثر ڈالنے والی ہوتی ہے، کسی پر موت آ رہی ہے تو اس مجلس میں جتنے موجود ہوتے ہیں ہر ایک کے دل پر خاص کیفیت طاری ہوتی ہے؛ چنانچہ اس وقت مرنے والا جو بات کرتا ہے وہ اپنے اندر خاص اثر رکھتی ہے اور مرنے والا بھی بڑی اہمیت اور تاکید کے ساتھ اس بات کو بیان کرتا ہے، اس لیے اس کو وصیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ عربی زبان میں وصیت ہر اس بات کو کہتے ہیں جو اہمیت کے ساتھ، مؤثر انداز میں کسی کے سامنے پیش کی جائے۔

بہر حال باری تعالی فرماتے ہیں، خود ایمان اور اعمال صالحہ کا اہتمام کریں اور

ساتھ ہی ساتھ دوسرے مرحلے میں آپس میں ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت یعنی تاکید کرتے رہیں۔

حق اور صبر سے کیا مراد ہے؟

مفسرین لکھتے ہیں کہ ایمان اور اعمال صالحہ کی تاکید کرنا یہ تواصی بالحق ہے۔

اور تواصی بالصبر سے مراد گناہوں سے بچنے کی آپس میں ایک دوسرے کو تاکید کرنا۔ بعضوں نے یہ بھی کہا کہ وتواصوا بالحق میں فقط آپس میں ایک دوسرے کو ایمان کی تاکید اور وصیت کرنا ہے، اور وتواصوا بالصبر میں اعمال صالحہ کا اہتمام اور گناہوں سے بچنے کی ایک دوسرے کو تاکید کرنا۔ گویا اعمال سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں صبر میں آ گئیں۔

ویسے بھی مفسرین اور اہل علم نے صبر کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں ایک قسم یعنی اعمال صالحہ کو انجام دینے میں آدمی کے جسم پر یا آدمی کی جان پر جو مشقت طاری ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا ہے، اس کو صبر علی الطاعات کہتے ہیں۔

سردی کی راتوں میں اٹھ کر وضو کرنا، پھر نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آنا کوئی آسان کام تو نہیں۔ اس میں آدمی کو مشقت لاحق ہوتی ہے۔ یا ایک آدمی پر زکاۃ فرض ہے اور وہ اپنے مال سے چالیسواں حصہ نکالے گا یا نفل صدقہ کے طور پر جو مال نکالے گا اس میں آدمی کے دل پر بوجھ پڑتا ہے۔ پیسے نکالنا کوئی آسان کام نہیں، اسی لیے بہت سے لوگ بخل کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ طاعت اور عمل صالح انجام دینے کے لیے مشقت اٹھانا ہوا۔ اس مشقت اور تکلیف

برداشت کرنے کو صبر علی الطاعات کہا جاتا ہے۔

گناہوں سے بچنے میں بھی آدمی کو مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ ہمارا نفس کہتا ہے کہ بدنگاہی کرو، نامحرم عورت جا رہی ہے، اس کی طرف دیکھو، فلانے کا مال ہڑپ کرلو، فلانے کا حق ادا نہ کرو۔ اس طرح گناہ کے کام کے لیے نفس اور شیطان آمادہ کرتے ہیں۔ نفس اور شیطان کے اس وسوسے اور ورغلانے سے بچا کر اپنے آپ کو گناہوں کے کام سے محفوظ رکھنے میں آدمی جو مشقت اٹھاتا ہے اس کو صبر عن المعاصی کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں معنی صبر میں آجاتے ہیں۔

اسی لیے بعض مفسرین نے کہا کہ ایمان کی ترغیب دینا، تاکید کرنا، اس کے لیے لوگوں کو آمادہ کرنا اور دعوت دینا تواصی بالحق میں شامل ہے۔ اور اعمال صالحہ کا اہتمام، نیز اس کو کرنے کی تاکید، اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام، نیز اس سلسلے میں جو کچھ بھی آپس میں ایک دوسرے کو تاکید اور نصیحت کی جائے وہ تواصی بالصبر میں داخل ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو حق بات یعنی ایمان کی تاکید کرتے رہیں، اس کی ترغیب دیتے رہیں، اسی طرح صبر یعنی نیک کام کرنے اور گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتے رہیں تو وہ لوگ البتہ گھاٹے سے محفوظ رہیں گے۔

نوعِ انسانی کے لیے خسارے سے بچنے کا راستہ

یہاں دو کام ضروری قرار دیے گئے۔ ایک یہ کہ آدمی خود ایمان اور اعمال

صالحہ کا اہتمام کر کے اپنی اصلاح کرے اور دوسروں کو اعمال صالحہ اور گناہوں سے بچنے کی تاکید کر کے ان کی تکمیل اور اصلاح کی بھی کوشش کرے، تب وہ گھاٹے سے نکلا ہوا سمجھا جائے گا۔

گویا بنی نوع انسان کو گھاٹے سے بچنے کا جو نسخہ قرآن پاک نے بتایا وہ یہ ہے کہ لوگ خود بھی اپنی اصلاح کا اہتمام کریں اور دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی کوشش کریں۔ خود بھی اپنے آپ کو کامل اور مکمل بنانے کا اہتمام کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں اور تاکید کریں۔ یہ دو چیزیں اگر آئیں گی تو البتہ گارنٹی دی جا سکتی ہے کہ وہ آدمی گھاٹے اور خسارے میں نہیں۔ معلوم ہوا کہ فقط اپنی اصلاح کر لینا کافی نہیں؛ بلکہ علی حسب المراتب جن جن لوگوں کی اصلاح کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہو، اس کے لئے اپنے آپ کو مشغول کرنا بھی نجات کے لیے اور اپنے آپ کو خسارے سے بچانے کے لئے ضروری ہے۔

بہر حال اللہ تبارک وتعالی نے اس سورت میں مختصر انداز میں نفع بخش اور کامیاب زندگی کس طرح گذاری جا سکتی ہے اس کے لیے چار چیزوں کی تعلیم دی ہے، (۱) خود ایمان کا اہتمام کرے۔ (۲) اعمال صالحۃ پر پابندی کرے۔ (۳) آپس میں اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی ایمان کی دعوت دیتا رہے (۴) اور اعمال صالحہ کے اہتمام اور گناہوں سے بچنے کی بھی آپس میں ایک دوسرے کو تاکید کرتا رہے۔

ان چار چیزوں کا اہتمام ہوگا تو آدمی اپنے آپ کو اس گھاٹے سے جس کی قرآن نے خبر دی ہے، یقینا بچا سکتا ہے۔ اور اگر ان چار چیزوں کا اہتمام نہیں کیا تو

قرآن میں باری تعالی نے جوبات قسمیہ طور پر فرمائی ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے، یعنی: إن الإنسان لفی خسر، میں داخل ہوسکتا ہے۔

آپس میں تواصی کا یہ سلسلہ آدمی کو جاری رکھنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ تبلیغی کام کی بنیاد بھی اسی تواصی پر ہے۔ یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ہم کو ان چاروں چیزوں پر عمل کی توفیق میسر آجاتی ہے۔

تبلیغی کام

حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ نے اسی کا ایک طریقہ بتلایا ہے۔

دیکھو! بہت سی مرتبہ آدمی نیک اعمال کی پابندی کرنا چاہتا ہے۔ نیک اور صالح بننا چاہتا ہے۔ اس کی تمنا ہوتی ہے، اس کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اپنے ماحول میں رہتے ہوئے بہت سارے اسباب بھی اختیار کرتا ہے مگر اس کے باوجود جب تک وہ اپنے ماحول میں ہوتا ہے، اپنے آپ کو بہت سے نیک اعمال کا پابند نہیں بنا سکتا، بہت سے گناہوں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ اس لیے ضرورت پڑتی ہے کہ جس ماحول میں رہ کر وہ اپنے آپ کو ایسا نہیں بنا سکتا، اس ماحول سے اپنے کو نکال کر ماحول کی رکاوٹوں سے خود کو دور کرکے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرے۔

ہمارے مرشد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرمایا کرتے تھے: کسی آدمی کو آسانی کے ساتھ نمازوں کا پابند بننا ہے اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا ہے تو اپنے ماحول سے نکل کر ایک مدت جماعت کے ساتھ لگادے۔

نمازوں کا اہتمام کرنے میں یا اعمال صالحہ کی پابندی اختیار کرنے میں اپنے ماحول میں اگر رکاوٹیں پیش آتی ہوں، یا گناہوں سے بچنے میں کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہو پاتا تو وہ اس ماحول میں آجائے، اس میں نیک لوگوں کی صحبت اور رفاقت ہوتی ہے، ان کی طرف سے رہ نمائی ہوتی ہے، آپس میں سیکھنے سکھانے کا موقع ملتا ہے۔ گویا یہ ایک چلتا پھرتا مدرسہ اور چلتی پھرتی خانقاہ ہے، اس میں آجائے اور کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص واقعۃً دیانت داری سے، سچے دل سے اپنی اصلاح کا خواہش مند ہو تو بہت آسانی سے اس کو یہ چیز میسر آسکتی ہے؛ ورنہ گھر پر رہتے ہوئے یہ چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور اس میں رکاوٹیں پیش آتی ہی ہیں۔ بہر حال یہ بہت آسان طریقہ ہے، جس کا نافع ہونا، اور مفید اور کار آمد ہونا ،اب ہر ایک کے سامنے برسوں کے تجربہ سے آچکا ہے۔

تبلیغی جماعت میں جانے کی نیت

ہمارے حضرت مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ آدمی جب جماعت میں نکلے تو اس کی نیت یہ ہو کہ: میں اس لیے جا رہا ہوں کہ میں خود صحیح طریقہ سے دین پر عمل کرنے والا بن جاؤں۔ ایسا جذبہ اور خیال لے کر نہ جائے کہ میں تو کامل اور مکمل ہوں، اور دوسروں کی اصلاح کے لیے جا رہا ہوں؛ بلکہ اپنی اصلاح کے لیے ،اپنی حالت کو درست کرنے کی نیت لے کر جائے۔

یہ سوچے کہ میں اور میرے جیسے دوسرے بھائی، سب مل کر آپس میں مذاکرہ کریں گے، اپنی کمزوریوں کا احتساب کریں گے، اس کا جائزہ لیں گے اور اس

کے بعد ان کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے مل جل کر محنت کریں گے۔ اعمال صالحہ پر پابندی کرنے کی جو مختلف تدبیریں تجربے سے نفع بخش ثابت ہو چکی ہیں، اسے اختیار کریں گے۔

یہ سلسلہ بڑا مفید اور کارآمد ہے، ہم اگر اس کو اخلاص کے ساتھ اپنائیں تو انشاء اللہ دنیا اور آخرت کی نجات کے لیے کافی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اخلاص کے ساتھ لگیں اور ہماری نیت یہی ہو کہ ہم اپنی حالت کو درست کر رہے ہیں، کسی پر تنقید یا کسی کی تحقیر ہماری نگاہ اور ہمارے دل میں نہ ہو، یہ خطرناک چیز ہے۔ ہم دارالافتاء میں بیٹھتے ہیں، ہمارے پاس بار بار شکایت آتی ہیں، پہلے اتنی کثرت سے شکایتیں نہیں آتی تھیں۔

اہل علم کا تعاون

ہمارا اور ہمارے اکابر کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ ہمارے بزرگوں کے جو مختلف سلسلے ہیں اس میں ایک سلسلہ یہ بھی ہے اور یہ کام بھی گویا ان سلسلوں کا ایک حصہ ہے، لہٰذا اس کام کے سلسلے میں جتنے اشکالات کیے جاتے ہیں، ہم دارالافتاء کے ذریعہ آپ کی طرف سے اس کا دفاع اور ڈیفنس کرتے ہیں۔ کوئی یوں نہ سمجھے کہ یہ لوگ ہمارا کوئی تعاون نہیں کرتے، ہمارا کوئی ساتھ نہیں دیتے، ہم علمی طور پر جتنا دفاع کرتے ہیں، اس کا لوگوں کو اندازہ نہیں؛ اگر یہ دفاع نہ ہو تو تبلیغ کے خلاف ایسی ایسی چیزیں شائع ہوتیں کہ کام کرنے والوں کو کوئی دنیا میں زندہ نہ رہنے دیتا۔

علمی طور پر اہل علم، مفتیان کرام اور علماء کرام اس کام پر ہونے والے

اعتراضات کا علمی انداز میں جائزہ لے کر اس کا دفاع کرتے ہیں، ہمارے اکابر بھی یہ خدمت کرتے تھے اور اسی کے نتیجہ میں کام کو تقویت ہوئی اور یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

حضرت جی مولانا یوسف صاحبؒ اور حضرت فقیہ الامتؒ

لطیفہ کے طور پر ایک قصہ سناتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ یہ قصہ ہمارے حضرت مفتی صاحبؒ کی زبان سے میں نے خود سنا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی خدمت میں ایک زمانہ گذارا ہے اور حضرت کے ساتھ بہت سے مقامات پر، خاص طور پر میوات کے علاقہ میں، دعوت وتبلیغ کی نسبت سے جانا بھی ہوتا تھا۔ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ بھی حضرت مفتی صاحبؒ کی جانب بڑی توجہ فرماتے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ پڑھ کر فارغ ہوکر آئے ہوئے تھے، اوران کی توجہ اس تبلیغ کے کام طرف زیادہ نہ تھی، ان کی طبیعت پر علمی مشغلہ ایسا غالب تھا کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی بہت کوشش کے باوجود اس کی طرف دھیان نہیں دیتے تھے۔

حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی طبیعت پر اس کا بڑا بوجھ تھا، حضرت چاہتے تھے کہ وہ کام کی طرف متوجہ ہوں۔ حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت جی نے مامور کیا کہ تم ان پر محنت کرو؛ چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ نے ان پر کوشش کر کے ان کو اس طرف متوجہ کیا، ایک مرتبہ جو ادھر متوجہ ہو گئے تو بعد کا حال

ساری دنیا جانتی ہے کہ کیا کارنامے انجام دیے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کلکتہ میں اجتماع تھا، وہاں سے حضرت مولانا یوسف صاحبؒ اپنے قافلہ کے ساتھ واپس لوٹ رہے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کانپور میں تھے۔

جیسا کہ لوگوں کا معمول ہے، اکابر کا قافلہ جب گذرتا ہے تو لوگ دعا اور ملاقات کے لیے پہنچتے ہیں، حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ کانپور ٹرین پر ملنے ہم سب بھی گئے۔ کانپور اسٹیشن پر جب ٹرین آئی تو ٹرین رکتے ہی سب نے چاہا کہ حضرت جی سے ملاقات کریں، مگر حضرت نے اعلان کر دیا کہ ابھی کسی سے ملاقات نہیں کروں گا، مجھے مفتی صاحب سے کچھ مسئلے پوچھنے ہیں۔ یوں فرما کر سب کو ہٹایا اور حضرت مفتی صاحبؒ کو لے کر الگ بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ کتنے دنوں سے میں چاہتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہوجاتی تو ان چیزوں کا تصفیہ ہوجاتا اور مسئلے پوچھ لیتا۔ اس گفتگو سے فارغ ہوئے تو ٹرین اٹھنے میں ایک دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا یوسف صاحبؒ نے مسئلے پوچھ لیے تو فرمایا کہ: اچھا، آپ کب نکلتے ہیں؟ حضرت مفتی صاحب فرمانے لگے کہ میں نے کہا کہ میں بھی نکلوں گا تو یہ مسئلے آپ کو کون بتائے گا؟ اس پر حضرت جیؒ مسکرا دیے۔

دین کے تمام شعبوں کو دین سمجھنا

بہر حال کہنے کا حاصل یہ ہے کہ دین کے تمام شعبوں میں اور کام کرنے والوں

میں آپس میں اتحاد اور اتفاق ہونا چاہیے۔ یہ تو دنیا کی خصوصیت ہے کہ اس کے طلبگاروں اور عاشقوں میں آپسی رقابت اور مقابلہ آرائی ہوتی ہے، دینی امور میں تو ہر ایک دوسرے کا معین و مددگار رہوتا ہے۔

دیکھئے! ہم آخری امت ہیں، ہمارے نبی، نبی کریم ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ہم عمل کرتے ہیں، اسی پر عمل کرنے میں ہماری نجات ہے، اس کے باوجود ہم میں ہر ایک پر لازم کیا گیا کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام سے حضرت عیسی علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام تک جتنے پیغمبر آئے، سب پر ہم ایمان لائیں۔

اسی طریقے سے دین کے مختلف شعبوں کو دین سمجھنا، ان کو درست سمجھنا ضروری ہے۔

حضرت جی مولانا انعام الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ، نے لاجپور کے اجتماع کے موقع پر آخری مجلس میں جو تقریر فرمائی تھی وہ مجھے خوب یاد ہے۔ میں جو عرض کر رہا ہوں، اسی کو سمجھاتے ہوئے حضرت نے فرمایا تھا کہ دین کے یہ تمام شعبے اہمیت کے حامل ہیں، ہر شعبے والے مل جل کر آپس میں ایک دوسرے کے تعاون سے ان کاموں میں لگے اور کسی کی تحقیر یا تنقیص دل میں نہ رکھے تو انشاء اللہ بڑی کامیابی ہوگی۔

کس کی خدمت مقبول ہے؟

کس کی خدمت اللہ کے یہاں قبول ہے وہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کوئی گارنٹی

نہیں دے سکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹا سا عمل نجات کا سبب بن جاتا ہے اور بڑی بڑی علمی و عملی خدمات ایک طرف رہ جاتی ہیں۔ ایسی عظیم خدمات والے بڑے بڑے اہل علم اور اکابر کے حالات میں آتا ہے کہ انتقال کے بعد کسی نے خواب میں ان کو دیکھا اور ان سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہوا؟ تو جواب میں فرمایا کہ فلاں معمولی عمل کی وجہ سے اللہ کے یہاں نجات ہوگئی۔

بہرحال عمومی پیمانہ پر ایک تجربے کی بنیاد پر پورے عالم میں اس وقت اللہ تبارک وتعالی نے اس سلسلے میں جس قدر برکت رکھی ہے اور اس کی وجہ سے عمومی اصلاح کا جو ماحول بنا ہوا ہے، ہماری کوشش یہ ہو کہ ہم بھی اس سے علیحدہ نہ رہیں، اس کی برکات سے فائدہ اٹھائیں، اپنی زندگیاں سنواریں۔

اللہ تعالی اس سلسلے کو مزید ترقی دے اور کام کرنے والوں کو بھی اخلاص، استقامت، ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے اور جو کچھ فروگذاشتیں ہیں، اللہ تعالی اس سے بچنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

خصوصیاتِ نبوی اور مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک

ہمارے اپنے ذاتی بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے قابو سے باہر ہوتے ہیں، ہم اپنے آپ ان مسائل کو حل نہیں کر پاتے، اس کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ اس کی بڑی آسان تدبیر ہے۔ ہمارے بھائیوں کے بھی اسی طرح کے بہت سارے مسائل ہیں، ہم خود تو اپنا مسئلہ حل نہیں کر سکتے ہیں، البتہ ہمارے بھائیوں کے اس طرح کے الجھے ہوئے مسائل میں سے بہت سے مسائل کو حل کرنے کی ہم میں طاقت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: تم اس کا کام کر دو، تو اللہ تعالی تمہارا کام کر دے گا۔

کتنا آسان طریقہ ہے۔

گنبد والی مسجد، 14-3-2008

عنوانات

الحمد الله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سئيات أعمالنا، و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سئيات أعمالنا، و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سئيات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له، و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و نشهد أن سيدنا و مولانا محمدا عبده و رسوله ۔أرسله إلى كافة الناس بشيرا و نذيرا و داعيا إلى الله بإذنه و سراجا منيرا۔

صلى الله تعالى عليه و على آله و أصحابه و بارک و سلم تسليماً كثيراً كثيراً، أما بعد۔

فعن أبى هريرة رضى الله تعالى عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة و من يَسَّر على معسر يسر الله عليه فى الدينا و الآخرة ومن ستر على مسلم ستر الله عليه فى الدنيا و الآخرة والله فى عون العبد ما كان العبد فى عون أخيه۔ أو كما قال عليه الصلوة و السلام (مسلم:۲۶۹۹، کتاب الذکر و الدعاء، باب فضل اجتماع تلاوۃ، بخاری، کتاب المظالم:۲۳۱۰) ابوداؤد، کتاب الأدب:۴۹۴۶)

یہ بخاری اور مسلم شریف کی ایک روایت کا کچھ حصہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالی نے جو جامع کلمات عطا فرمائے تھے، ان کا ایک نمونہ بھی ہے۔

خصوصیات نبوی

اللہ تبارک وتعالی نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعض ایسی خصوصیات اور امتیازی

صفات عطا فرمائی تھیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کی گئی تھیں۔ بخاری اور مسلم شریف میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے۔(بخاری، الصلاۃ، ابواب استقبال القبلۃ: ۴۲۲)۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

أعطيت خمسا لم يعطهن أحد قبلي۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا کی گئیں کہ مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو وہ چیزیں عطا نہیں کی گئیں۔

اول: رعب اور ہیبت

پہلی خصوصیت کے متعلق آپ ﷺ فرماتے ہیں: **نصرت بالرعب مسيرة شهر**۔ اللہ تعالیٰ نے رعب اور ہیبت کے ذریعہ میری مدد فرمائی ایک مہینہ کی مسافت اور دوری تک۔ یعنی اتنی دور تک نبی کریم ﷺ کی ہیبت اور آپ ﷺ کا رعب اپنا اثر دکھلاتا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے دشمن بھی آپ کے سامنے آکر تھر تھر کانپتے تھے، زیر ہوجاتے تھے۔

کسریٰ شاہِ فارس پرویز کے نام آپ ﷺ کا خط

روایتوں میں واقعہ مذکور ہے کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے شاہ فارس کسریٰ کے نام دعوتِ اسلام کا خط بھیجا اس زمانہ میں جو کسریٰ تھا، اس کا نام پرویز تھا۔ پرویز ابن ہرمز ابن نوشیروان۔ کسریٰ فارس کے بادشاہ کا لقب ہے، اصل اس کا نام پرویز تھا۔ نوشیروان اپنے عدل وانصاف میں بڑا مشہور بادشاہ گذرا ہے،

اس کا یہ پوتا تھا۔

جس زمانہ میں نبی کریم ﷺ نے دنیا کے حکمرانوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط روانہ فرمائے اس وقت فارس کے تخت پر یہی حکمران تھا۔ نبی کریم ﷺ نے جب اس کے نام اسلام کی دعوت کا خط بھیجنا چاہا تو سابقین اولین یعنی شروع میں ایمان لانے والے ایک بڑے مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ آپ نے وہ خط اس کے پاس بھیجا۔

اس زمانہ کے دستور کے مطابق بڑے بادشاہوں کو براہِ راست خطوط حوالے نہیں کیے جاتے تھے۔ اس لیے حضرت عبد اللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا یہ مبارک خط منذر بن ساوی کے حوالہ کیا، جو بحرین کے حاکم تھے، اور بحرین اور یمن کا علاقہ اس زمانہ میں فارس کے ماتحت تھا۔ چنانچہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کا یہ خط کسریٰ کے پاس پہنچایا۔

مکتوب نبوی کا مضمون

اس خط میں نبی کریم ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی تھی اور خط میں تحریر فرمایا تھا کہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد رسول اللہ إلی عظیم فارس۔ یہ خط اللہ کے نام سے شروع کیا جاتا ہے جو بڑا ہی مہربان اور رحمت والا ہے، یہ خط اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول حضرت محمد رسول ﷺ کی طرف سے فارس کے حاکم کے نام ہے۔ خط میں اس کے علاوہ زیادہ لمبے چوڑے القاب اور آداب نہیں لکھے

گئے تھے۔

اس کے بعد سلام تھا، **سلام علی من اتبع الهدی**، جو لوگ ہدایت کے راستے پر چلتے ہیں ان کے لیے سلامتی ہو اور اخیر میں لکھا: **اسلم تسلم**، اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے۔

فإن أبيت فعليك إثم المجوس اگر تم نے اسلام لانے سے انکار کیا اور تمہارے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے تمہاری رعایا جو مجوسی ہیں وہ بھی اسلام قبول نہیں کرے گی تو ان کا سارا گناہ اور وبال تیرے اوپر پڑے گا۔

کسریٰ پرویز کا غرور

یہ بڑا مغرور تھا، جب نبی کریم ﷺ کا یہ مبارک خط اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا کہ میری رعیت کا آدمی ہو کر مجھ کو برابر کا خطاب کرتا ہے۔ بڑے غصے کا اظہار کیا اور نبی کریم ﷺ کے مبارک خط کو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب پتہ چلا کہ آپ کے نامہ مبارک کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی کا یہ معاملہ کیا گیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: **أن يمزقوا كل ممزق** (بخاری: ۴۱۶۲)۔ ان کے بھی اللہ تعالیٰ ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نبی کریم ﷺ کی یہ بددعا ظاہر ہوئی۔ لیکن اس سے پہلے جو معاملہ ہوا وہ میں بتلانا چاہتا ہوں، اس نے غصے کے اظہار کے ساتھ خط مبارک کو تو ٹکڑے کر دیا، ساتھ ہی یمن کے حاکم باذان کے پاس- جو اس زمانہ میں اسی کے ماتحت تھے- پیغام بھیجا کہ دو پہلوان اور بہادر آدمیوں کو مدینہ بھیجا جائے، جو ان کو

یعنی آپ ﷺ گرفتار کر کے میرے پاس لائے۔ چنانچہ باذان نے دو پہلوان اور بہادر آدمیوں کو خط لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجا۔

کسریٰ کے پہلوان دربارِ نبوی میں

روایتوں میں ہے کہ جس وقت وہ مدینہ منورہ پہنچے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے چہرہ انور پر ان کی نظر پڑی تو ایسے مرعوب ہوئے کہ پہلوان ہونے کے باوجود تھر تھر کانپنے لگے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو تسکین دی اور پوچھا کہ کیوں آئے ہو،؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ خط لے کر بھیجا گیا ہے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ آپ کو گرفتار کرنے کے لیے ان دونوں کو بھیجا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے جب یہ خط پڑھا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کل اس کا جواب دوں گا۔

داڑھی منڈے چہرے سے نبی کریم ﷺ کی نفرت

اس روایت کے ضمن میں یہ بھی ہے کہ ان کی ڈاڑھیاں منڈی ہوئی تھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں، ان کی ہیئت کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا، تم نے اپنا چہرہ ایسا کیوں بنایا ہے؟ ڈاڑھیاں مونڈ رکھی ہیں، مونچھیں بڑھا رکھی ہیں، انہوں نے کہا کہ ہمارے رب نے یعنی کسریٰ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے، تو نبی کریم ﷺ فرمایا کہ میرے رب نے تو مجھے یہ حکم دیا ہے کہ مونچھوں کو کترو اور ڈاڑھی کو بڑھاؤں۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی اس ہیئت کو دیکھ کر ناگواری کا اظہار کر کے نبی کریم ﷺ نے اپنا چہرۂ انور پھیر لیا، حالاں کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔

ہمارے اکابر اس واقعہ کو بیان کر کے لکھا کرتے ہیں کہ ایک مؤمن جو نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا ہو بھلا وہ اپنی شکل وصورت نبی کریم ﷺ کی شکل وصورت سے الگ ایسی بنائے کہ اس پر نبی کریم ﷺ نے ناگواری کا اظہار فرمایا ہو، کیسے درست ہوسکتا ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا رسالہ ہے، ڈاڑھی کا وجوب، حضرتؒ اس میں اس واقعہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جو لوگ ڈاڑھیاں منڈاتے ہیں وہ ذرا سوچیں کہ قبر میں جانے کے بعد جب فرشتے سوال کرنے آئیں گے اور سوال کریں گے: من ربک؟ وما دینک؟ وما تقول بھذا الرجل؟ تمہارا پروردگار کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اور نبی کریم ﷺ کی اشارہ کر کے پوچھیں گے کہ ان کے متعلق یعنی نبی کریم ﷺ کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ اس وقت قبر میں اگر نبی کریم ﷺ نے چہرہ پھیر لیا تو کیا ہوگا؟ جن کی شفاعت پر ہم بھروسہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں وہ اگر سفارش کرنے سے انکار کر دیں تو؟

کسری پرویز کا قتل اور نبوی پیشین گوئی کا تحقق

بہر حال دوسرے دن جب وہ لوگ آئے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آج رات کو میرے رب نے تمہارے رب کو قتل کروا دیا۔ انہوں نے یہ سنا تو تاریخ نوٹ کر لی، جمادی الاولی کی دسویں تاریخ، سن سات ہجری، اور منگل کی رات تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہی جواب ہے، جاؤ۔ یہ لوگ جب اس جواب کو لے کر یمن کے حاکم باذان کے پاس پہنچے ہیں تو باذان نے کہا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو یہ

شخص واقعتاً سچے نبی ہیں، چنانچہ جب اس نے تحقیق کرائی تو پتہ چلا کہ پرویز کے بیٹے شیرویہ نے ہی اپنے باپ کو اس روز قتل کیا تھا۔

پرویز کی ایک بیوی شیرین نام کی تھی، بڑی حسین وجمیل تھی۔ پرویز کا بیٹا شیرویہ اپنے باپ کی اس بیوی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے باپ کو ختم کرنے کی تدبیریں کرتا تھا، اسی کوشش میں اس نے اپنے باپ کو نظر بند کر دیا تھا۔ پرویز کو بھی جب یقین ہو گیا کہ اب یہ مجھے قتل ہی کرے گا تو نظر بندی کے زمانہ میں ہی اس نے بیٹے کو ختم کرنے کی تدبیر کر لی۔ وہ اس طرح کہ اس کا یہ بیٹا عورتوں کا بڑا دلدادہ تھا اور قوت باہ یعنی مردانگی میں اضافہ پیدا کرنے والی دواؤں کو بہت زیادہ استعمال کرتا تھا۔ پرویز نے اپنی الماری کی دواؤں میں سے زہر ہلاہل کی شیشی پر لیبل لگا دیا: 'قوت باہ کی شاندار دوا'۔ پھر جب شیرویہ نے اس کو قتل کر دیا اور وہ تختِ حکومت پر آیا تو اس نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے سارے بھائیوں کو قتل کر دیا تاکہ کل اٹھ کر کوئی حکومت کا دعوے دار نہ ہو۔

اس کے بعد وہ ایک دن اپنے باپ کے کمرے میں گیا، الماری کھولی اور اس میں یہ شیشی دیکھی تو اس نے یہ سمجھ کر کہ یہ مقوئ باہ شاندار دوا ہے، استعمال کر لی۔ نتیجتاً اس کی موت ہو گئی۔ اب حال یہ ہے کہ اس وقت اس شاہی خاندان میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہ تھا جس کو تخت حکومت پر بٹھایا جا سکے۔ البتہ اسی شیرویہ کی ایک بیٹی تھی، بوران نام کی۔ اہل فارس نے شاہی خاندان سے ہٹ کر کسی دوسرے مرد کو تخت پر بٹھانا مناسب نہیں سمجھا تو اس کی بیٹی ہی کو حاکم بنا دیا۔ جب نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا کہ اہل فارس نے ایک عورت کو اپنا حاکم بنایا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا

کہ: لَنْ يَفْلَحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امرَأةً۔ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنا حکمران کسی عورت کو بنائے۔

بعد میں تو حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں یہ سارا علاقہ مسلمانوں کے پاس آ گیا اور فارس کی حکومت بالکلیہ ختم ہوگئی۔ آپ ﷺ نے باذان کو جواب میں یہ بھی کہلوایا تھا کہ تم اپنے رب سے کہو کہ میری حکومت وہاں تک جائے گی جہاں تک تمہاری حکومت ہے۔

بہرحال! میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالی نے جو امتیازی خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں ایک رعب اور ہیبت تھی۔

دوم: ساری زمین مسجد

دوسری خصوصیت حضرت جابرؓ کی اسی روایت میں ہے کہ: جلعت لی الارض مسجدا و طهورا فأيما رجل من أمتي أدركته الصلاة فليصل۔ اللہ تعالی کی طرف سے میرے لیے زمین کو پاکی کا ذریعہ اور نماز کی جگہ بنا دیا گیا، پہلی امتوں میں یہ تھا کہ نماز پڑھنے کے لیے جگہیں مقرر تھیں، جیسے کہ مسجد نماز پڑھنے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کے لئے ضروری تھا کہ نماز پڑھنے کے لیے اور عبادت کے لیے جو مکانات بنائے جاتے تھے، اسی میں نماز پڑھ سکتے تھے، اس کے علاوہ عام جگہوں پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی، اللہ تبارک وتعالی نے اس امت کو نبی کریم ﷺ کے صدقے میں یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ- ایسے تو مسجد ہی میں نماز پڑھنی چاہیے-لیکن کبھی کوئی ایسا موقع آئے کہ مسجد نہیں ہے تو کہیں بھی آدمی

نماز پڑھ سکتا ہے، اسی خصوصیت میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ تعالی نے زمین کو اور مٹی کو پاکی کا ذریعہ بنایا۔ پانی نہیں تو آدمی تیمم کرکے پاکی حاصل کرلے اور نماز کا وقت آجائے تو نماز پڑھ لے، نماز چھوڑنی نہیں چاہیے۔

سوم: مالِ غنیمت کا حلال ہونا

تیسری بات: نبی کریم ﷺ نے فرمائی کہ: **أحلت لی الغنائم ولم تحل لأحد قبلی** ہمارے لیے اللہ تعالی کی طرف سے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا گیا۔

جہاد کا سلسلہ اگلی امتوں میں بھی تھا؛ لیکن دشمن کے مقابلہ میں کامیابی ہونے کے بعد جو مال و جائداد غنیمت کے طور پر ہاتھ میں آئے اس کو استعمال کرنے کی اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے اجازت نہیں تھی؛ بلکہ سارے مال غنیمت کو کسی پہاڑ پر رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آکر کے اس کو کھالیا کرتی تھی اور یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ ان کا یہ جہاد اللہ کے یہاں قبول ہو گیا ہے۔ اگلی امتوں میں سے کسی امت کے لیے بھی مالِ غنیمت حلال نہیں تھا۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں اللہ تعالی نے میرے لیے اور میری امت کے لیے اس کو حلال قرار دیا۔

چہارم: شفاعتِ کبری۔

چوتھی خصوصیت جو آپ نے بتلائی وہ یہ ہے کہ: **اعطیت الشفاعة** اللہ تعالی نے مجھے شفاعت کبری عطا فرمائی۔

جب دوسرا صور پھونکا جائے گا اور تمام خلقت کو، اولین وآخرین کو دوبارہ پیدا

کر کے میدان حشر میں اللہ تبارک وتعالی جمع فرمائیں گے تو یہ سب میدان حشر میں جمع ہوں گے، سورج سوا نیزے پر ہوگا، اور زمین تانبے کی طرح تپی ہوئی ہوگی، اس وقت لوگوں کی بے چینی اور اضطراری کیفیت نا قابل برداشت ہوگی۔ کیوں کہ حساب کتاب کا سلسلہ ابھی شروع نہیں ہوا، خاموشی طاری ہے، اور کسی میں ہمت نہیں کہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں عرض کرے کہ حساب کتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے، جب اسی حالت پر ایک بڑا طویل زمانہ گذر جائے گا اور لوگ خوب پریشان ہوں گے تو آپس میں مشورہ کریں گے کہ بھائی کسی سے درخواست کی جائے کہ باری تعالی کے حضور میں عرض کرے کہ حساب کتاب کا سلسلہ شروع ہو، جو بھی فیصلہ ہو اس پار یا اس پار؛ یہ انتظار کی گھڑیاں اور یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔

چنانچہ سب لوگ مل کر حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ آپ تو سارے انسانوں کے جدامجد ہیں، اور اللہ تعالی نے براہِ راست اپنے دستِ قدرت سے آپ کو پیدا کیا، آپ کے سامنے تو فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، آج اس مصیبت میں ہم گرفتار ہیں، اللہ تعالی سے ہماری سفارش کر کے حساب کتاب کا سلسلہ شروع کروائیے۔ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام انکار کریں گے کہ میں نہیں کر سکتا؛ البتہ وہ حوالہ دیں گے حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کا۔

لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے، وہ بھی انکار کریں گے اور حوالہ دیں گے حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا۔

لوگ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، مگر وہ بھی انکار کریں گے، اور حوالہ دیں گے حضرت موسی علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا۔

حضرت موسیٰؑ بھی انکار کریں گے، اور حوالہ دیں گے حضرت عیسی علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کا۔

لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے وہ بھی معذرت کریں گے اور آخر میں وہ حوالہ دیں گے نبی کریم ﷺ کا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگ میرے پاس آئیں گے تو میں اللہ کے حضور حاضر ہو کر اللہ کے سامنے سجدے میں گر جاؤں گا اور اللہ تعالی کی ایسی حمد و ثنا بیان کروں گا کہ مجھے بھی وہ کلمات اس وقت مستحضر نہیں، اسی موقع پر اللہ تعالی ان کلمات کو میرے اوپر القاء فرمائیں گے۔

نبی کریم ﷺ دیر تک سجدے میں رہیں گے، پھر باری تعالی کی طرف سے کہا جائے گا کہ سر اٹھایئے اور کہیے آپ کی بات سنی جائے گی، آپ سفارش کیجئے، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی، اس وقت نبی کریم ﷺ عرض کریں گے کہ حساب کتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ آپ کی درخواست پر یہ سلسلہ شروع ہوگا، اسی کو 'شفاعت کبری' کہتے ہیں، یعنی ایسی سفارش جس کا فائدہ تمام لوگوں کو حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر اخیر تک کے تمام لوگوں کو پہنچے گا اور اولین و آخرین اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اور اس سے راحت محسوس کریں گے۔ یہی وہ 'مقام محمود' ہے جس کا اللہ تبارک وتعالی نے نبی کریم ﷺ کو قرآن پاک میں **عسى أن يبعثك ربك مقاما محمودا** والی آیت میں وعدہ فرمایا ہے۔

پنجم: بعثتِ عامہ

اور آگے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں وکان النبی یبعث إلی قومه خاصة فبعثُتُ إلی الناس عامة، کہ اگلے جتنے نبی بھی گذرے ان کا حال تو یہ تھا کہ وہ صرف اپنی قوم کی طرف اللہ کا پیغام لے کر اور نبی بنا کر بھیجے جاتے تھے، جب کہ اللہ تعالی نے مجھے ساری انسانیت کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ یہ بھی آپ کی خصوصیت ہے۔

دو اور خصوصیات، جوامع الکلم اور ختم نبوت

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں دو چیزوں کا مزید اضافہ ہے، وأعطیت جوامع الکلم، اللہ تبارکوتعالی کی طرف سے مجھے جامع کلمات دیے گئے، اسی کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اللہ تبارک وتعالی نے حضور پاک ﷺ کو وہ صلاحیت عطا فرمائی تھی کہ مختصر جملے فرماتے تھے؛ لیکن اس میں بہت سارے معانی چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہوں ایسے کلمات کو 'جامع کلمات' کہتے ہیں۔ یہ حضور اکرم ﷺ کا امتیازی وصف تھا۔

اور ایک مزید خصوصیت حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ بھی مروی ہے کہ ختم بی النبیون، میرے ذریعہ نبیوں کے سلسلے کو اللہ تبارک وتعالی نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، آپ خاتم النبیین ہیں، نبوت کے سلسلے کو کمال وتمام پر پہنچانے والے ہیں، اور آپ کے بعد نبوت والا کام اللہ تبارک وتعالی نبی کریم ﷺ کی امت کے ذریعہ لیں گے۔

پریشانی میں مومن کی مدد

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی جو روایت میں نے پیش کی ہے، اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ جامع کلمات سے تعبیر کی جاتی ہیں، اور اس میں پہلی بات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمائی وہ یہ ہے:

من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة۔

جو آدمی کسی مسلمان کے لیے دنیا کی ایک تکلیف کو، معمولی تکلیف کو ہی سہی، دور کرے گا تو اللہ تبارک تعالی اس کی آخرت کی بہت بڑی تکلیف کو اور پریشانی کو دور فرمائیں گے۔ گویا دنیا میں کسی مؤمن کی معمولی تکلیف دور کرنے پر اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے آخرت کی بڑی پریشانی اس سے دور کی جائے گی۔

مخلوق کے ساتھ اللہ تعالی کی محبت۔

اللہ تبارک وتعالی کا اپنی مخلوق کے ساتھ بہت شفقت کا معاملہ ہے اور اللہ تعالی کو اپنی مخلوق کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ اللہ تعالی نے ہی تو مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔ ہم کوئی چیز بناتے ہیں تو ہماری بنائی چیز ہم کو بڑی اچھی لگتی ہے، چاہے دنیا پسند کرے یا نہ کرے، ہمارے دل میں تو لگی رہتی ہے، کوئی اس کے متعلق ایک لفظ بھی بولے تو ہمیں گوارا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اللہ تعالی نے چوں کہ

اپنی مخلوق کو پیدا فرمایا اس لیے اپنی مخلوق کے ساتھ بڑی محبت ہے، بڑی شفقت اور مہربانی ہے۔

چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں، **الخلق عیال الله، فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله** (شعب الایمان، بیہقی : ۴۵۶۹)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، ساری مخلوق اللہ کا پریوار ہے، دیکھو، یہاں نبی کریم ﷺ مخلوق کو اللہ کے کنبے سے تعبیر فرماتے ہیں، ایک آدمی کو اپنے کنبے کے ساتھ اور اپنے پریوار کے ساتھ کیسا محبت کا تعلق ہوتا ہے وہ ہم جانتے ہی ہیں۔

حدیث شریف میں ساری مخلوق کو اللہ کا کنبہ کہا گیا۔ اس میں کوئی تفریق نہیں، کوئی بھی ہو؛ چاہے وہ مؤمن ہو یا کافر ہو، اور اسی طریقے سے انسان ہو یا کوئی جانور ہو، سب ہی کو پریوار سے تعبیر کیا گیا۔ اور پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں : **فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله**۔ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اللہ کی نگاہوں میں وہ ہے جو اللہ کے اس کنبے کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرتا ہو۔ معلوم ہوا کہ جو بندہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے بڑے خوش ہوتے ہیں اور بہت راضی ہوتے ہیں۔

کرو مہربانی تم اہل زمین پر۔

اسی لیے ایک اور روایت میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں، **الراحمون يرحمهم الرحمن تبارك و تعالى، ارحموا من في الارض يرحمكم من**

فی السماء (ترمذی : ۱۸۴۳) ۔کہ جو لوگ اللہ کی مخلوق کے اوپر مہربانی اور شفقت کرنے والے ہیں، ان کے اوپر اللہ تعالی رحمت، مہربانی اور شفقت کا معاملہ کرتا ہے، اس لیے تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

کرو مہربانی تم اہل زمین پر -- خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

کسی نے اس شعر میں حدیث کے اُن الفاظ کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالی کو اپنی مخلوق کے ساتھ بڑی شفقت ہے، اسی لیے کسی مخلوق کے ساتھ جب کوئی آدمی بھلائی کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کو بہت بڑے انعام سے نوازتے ہیں۔

اللہ تعالی کی اپنی مخلوق کے ساتھ نا قابل بیان محبت

اللہ تعالی کو اپنی مخلوق کے ساتھ کیسا محبت کا تعلق ہے۔!

اور اس میں بھی انسانوں کے ساتھ تو نا قابل بیان محبت ہے۔

بخاری شریف میں کتاب الادب کی روایت ہے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کی خدمت میں کچھ قیدی لائے گئے۔ان قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی، اس عورت کا کوئی دودھ پیتا بچہ تھا، جو اس وقت اس کے پاس نہیں تھا اور اس وقت اس عورت کی چھاتیوں میں دودھ جوش مار رہا تھا۔ جو عورت دودھ پلانے والی ہوتی ہے، اس کے دودھ پلانے کے زمانے میں جب اس کی چھاتیوں میں دودھ جمع ہو جاتا ہے تو عورت بے چین ہو جاتی ہے، اور جب تک وہ بچے کو دودھ نہ پلا دے اس کو سکون و چین حاصل نہیں ہوتا۔ یہ عورت بھی چھاتیوں

میں دودھ جمع ہونے کی وجہ سے بے قرار تھی اور چکر کاٹ رہی تھی۔ اتنے میں اس کو اپنا بچہ نظر آیا تو جلدی سے لے کر اس کو اپنی چھاتی سے لگالیا۔ اس منظر کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین سے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سوال کے جواب میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ ہرگز اپنے بچے کو آگ میں نہیں ڈالے گی۔

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: للّٰہُ أرحم بعبادہ من ھذہ بولدھا یہ عورت اپنے بچے کے ساتھ جیسی مہربان ہے، اللہ تعالی اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ مہربان ہیں اور اللہ تعالی کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔

دنیا کی ایک فیصد محبت اور آخرت کی ننانوے فیصد محبت

حدیث پاک میں آتا ہے، بخاری شریف کتاب الادب کی روایت ہے کہ: اللہ تعالی کی صفتِ رحمت کے ننانوے حصوں میں سے ایک حصہ دنیا میں اتارا گیا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ماں اپنے بچے سے، جانور، انسان، جتنی بھی مخلوقات ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ مہربانی اور سلوک کرتی ہیں۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثال سے سمجھاتے ہیں کہ گھوڑی کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنا پیر اونچا رکھتی ہے کہ کہیں بچہ اس کی وجہ سے کچل نہ جائے، رات بھر ایک پیر اونچا رکھ کر کھڑی رہے گی کہ بچہ اس کے پیروں تلے کچل نہ جائے۔ (بخاری، کتاب الادب، ۵۶۵۴)

ایک جانور میں محبت کا جو یہ اثر آیا ہے وہ اللہ تبارک وتعالی کی اسی صفت کا اثر ہے، اور دنیا میں ایک حصے کا یہ اثر ہے تو جب قیامت کے روز باقی حصوں کا ظہور ہوگا تو اس وقت کیا حال ہوگا؟ اللہ تعالی کی اسی رحمت کا نتیجہ ہوگا کہ اس وقت کافر بھی امید رکھیں گے کہ ہمارے ساتھ بھی کچھ رحمت کا معاملہ ہو جائے گا۔

لله أرحم بعباده من أم الأفراخ بفراخها

ایک اور روایت ہے، حضرت عامرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی ایک چادر اوڑھے ہوئے آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے اوپر بھی چادر لپیٹ رکھی تھی، جب وہ نبی کریم ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوا تو آکر اس نے عرض کیا کہ

اے اللہ کے رسول! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گذر رہا تھا۔ مجھے اس کے اندر سے پرندے کے بچوں کے بولنے کی آواز آئی، میں اندر گیا تو دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں نے ان بچوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی چادر اس پر ڈال دی، جب میں درختوں کے اس جھنڈ سے باہر آیا تو پرندوں کی ماں میرے سر پر چکر کاٹنے لگی، اور منڈلانے لگی۔ اس منظر کو دیکھ کر میں نے وہ چادر جو بچوں کے اوپر ڈھانپ رکھی تھی وہ ہٹا دی، بچے ابھی اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ خود اڑ سکیں، اس لیے وہ تو اڑ نہ سکے؛ مگر جب چادر ہٹائی تو وہ ماں آکر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ گئی اور چپک گئی۔ میں اس کو اٹھا رہا ہوں اور نکال رہا ہوں، مگر وہ جانے کا نام نہیں لیتی تھی، بالآخر میں نے اس پر بھی کپڑا ڈال دیا اور یہ سب میرے پاس ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، نیچے رکھو، انہوں نے کپڑا ہٹایا اور بچوں کو نیچے

رکھا تو وہ ماں بھی ان کے ساتھ تھی۔ دیکھئے! ماں تو اڑ سکتی تھی؛ لیکن اپنے بچوں کی وجہ سے وہ اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالے ہوئے نہیں اڑ رہی ہے۔

اس منظر کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: **أتعجبون لرحم أم الأفراخ بفراخها، فوالذی بعثنی بالحق لله أرحم بعباده من أم الأفراخ بفراخها۔** (مشکوۃ شریف: ۲۳۷۷)

بچوں کی ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ مہربانی، شفقت اور محبت کا جو تعلق ہے اس پر تم کو تعجب ہوتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے دینِ حق لے کر بھیجا ہے، اللہ تبارک و تعالی کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت اور تعلق ہے، جتنا اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے۔

انسان کی مادی وروحانی ضرورتوں کا انتظام

اللہ تعالی نے اسی محبت کی وجہ سے پوری انسانیت، بلکہ پوری کائنات کی تمام ضرورتوں کا اس دنیا میں انتظام کر دیا، مادی بھی اور روحانی بھی۔ دنیا میں اگر ہماری تمام مادی ضرورتیں پوری کی جارہی ہیں، کھانے پینے، رہنے، وغیرہ کی، وہیں ہماری روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی اللہ تبارک وتعالی نے حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا، کہ وہ آ کر اللہ کے بندوں کو بتلائیں کہ اللہ تعالی اپنے بندوں سے کیا چاہتے ہیں، کیوں پیدا کیا ہے؟

اللہ تعالی خود فرماتے ہیں کہ ساری کائنات کو ہم نے اپنی نعمتوں سے بھر دیا ہے، **و سخر لكم ما فی السموت ومافی الأرض وأسبغ عليكم نعمه**

ظاہرۃ و باطنۃ، اللہ تعالی نے جو کچھ آسمان و زمین میں ہیں، وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے، یعنی تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے، اور اللہ نے اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر بارش کی طرح برسا دی ہیں۔

اللہ تعالی نے کائنات میں حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا جو سلسلہ جاری کیا ہے وہ بھی اسی محبت کی وجہ سے ہے کہ اللہ کے بندے اللہ سے بچھڑے ہوئے نہ رہیں، اللہ کے نبی آکر ان کو بتلائیں کہ وہ اپنا تعلق اللہ تعالی کے ساتھ کس طرح قائم کر سکتے ہیں، اس لیے کہ یہ چیز اللہ تعالی اپنے نبیوں کے ذریعہ نہ بتلاتے تو انسانیت کو اس کا پتہ نہ چلتا۔

حواس کے ذریعہ مرضی مولی کو معلوم کرنا ممکن نہیں

آدمی کی اپنی عقل اور اپنے حواس یعنی وہ ظاہری اعضاء، جن سے ہم مختلف معلومات حاصل کرتے ہیں، آنکھوں سے دیکھ کر، کانوں سے سن کر، ہاتھوں سے چھوکر، زبان سے چکھ کر، ان سارے اعضاء میں سے کسی میں صلاحیت نہیں کہ وہ اللہ تعالی کی مرضی اور نامرضی کو معلوم کر سکیں۔ آدمی کی عقل میں بھی وہ صلاحیت نہیں کہ وہ اللہ تعالی کی مرضی اور نامرضی کو جان سکے۔

اللہ کی مرضی اور نامرضی تو بہت بڑی بات ہے، ایک اپنے جیسے انسان کی مرضی بھی نہیں جان سکتا۔ ایک آدمی سامنے بیٹھا ہے، کیا میں اور آپ یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا آدمی مجھ سے کیا چاہتا ہے، کس چیز سے خوش ہے، کس چیز سے ناراض ہے۔ جب ایک آدمی اپنے جیسے انسان کی مرضی اور نامرضی کو اس

کے بتلائے بغیر نہیں جان سکتا تو اللہ تعالی کی مرضی اور نا مرضی کا پتہ اس کے بتلائے بغیر کیسے چلے گا؟ اسی لیے حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے سلسلے کو جاری کیا گیا۔

گویا اللہ تعالی نے اپنی ذات کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے ہی حضرات انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا اور اخیر میں نبی کریم ﷺ کو انہی حضرات انبیاء کا سردار بنا کر آپ کی ذات اقدس پر نبوت مکمل فرمائی تو پھر اس سلسلہ کو قیامت تک آپ کی امت کے ذریعہ جاری رکھا۔

اللہ کہاں ہوتے ہیں؟

حدیث میں آتا ہے، مسلم شریف (۴۶۶۷) میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالی انسان کو کھڑا کر کے سوال کریں گے۔

دیکھو، انسانوں کے ساتھ اللہ تعالی کو کیسا تعلق ہے، کیسی محبت ہے؟

پوچھیں گے کہ اے ابن آدم، اے انسان! میں بیمار ہوا، مگر تو نے میری خبر گیری نہیں کی اور میری عیادت اور تیمارداری نہیں کی، اس کے جواب میں انسان عرض کرے گا، اے باری تعالی! آپ تو رب العالمین ہیں، بھلا آپ کیسے بیمار ہو سکتے ہیں اور میں کیسے آپ کی تیمار داری کر سکتا ہوں؟ باری تعالی جواب میں فرمائیں گے: تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی، تجھے معلوم نہیں اگر تم اس کی خبر لیتے اور اس کی عیادت کرتے، تیمارداری کرتے

تو مجھ کو وہاں پر پاتے۔

آپ اندازہ لگائیں، بندے پر آنے والی بیماری کو اللہ تعالی منسوب کر رہے ہیں، کس کی طرف، اپنی طرف۔

اللہ کی شان تو بہت اونچی ہے، اللہ تعالی تو ان ساری چیزوں سے پاک اور منزہ ہے، لیکن بندوں سے اپنا تعلق ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالی اس انداز میں سوال کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اس کو بیان کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالی کو اپنے بندوں کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟

آگے اسی روایت میں ہے، اللہ تعالی انسان سے پوچھیں گے، اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، اس کے جواب میں وہ عرض کرے گا: باری تعالی! آپ تو رب العالمین ہیں، بھلا میں آپ کو کیسے کھانا کھلا سکتا ہوں؟ باری تعالی فرمائیں گے: تجھے معلوم نہیں، میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا؛ لیکن تو نے اس کو کھانا نہیں دیا، تجھے معلوم نہیں اگر تو اس کو کھانا دیتا تو اس کا اجر اور ثواب یہاں پاتا۔

دیکھو! بندے کی بھوک کو اور بندے کی کھانے کی حاجت کو اللہ تبارک وتعالی اپنی طرف جوڑ رہے ہیں، حالاں کہ اللہ تعالی محتاج نہیں ہے، اللہ تو ان ساری چیزوں سے پاک ہے۔

اسی حدیث میں آگے ہے، باری تعالی فرماتے ہیں: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے مجھے پانی نہیں دیا، انسان وہی جواب عرض کرے گا، باری تعالی آپ تو رب العالمین ہیں، بھلا میں آپ کو کیسے پانی پلا سکتا ہوں؟ آپ تو کہاں

پیاسے ہو سکتے ہیں، تو باری تعالی فرمائیں گے، میرے فلانے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا، تم نے اسکو پانی نہیں دیا اگر دیتے تو اس کا اجر اور ثواب یہاں پاتے۔

لوگوں کو اللہ سے جوڑنا بڑا نیکی کا کام ہے۔

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے، کہ جب کسی بیمار کی خبر لینے پر اور کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر اور کسی پیاسے کو پانی پلانے پر اللہ تعالی اتنا راضی ہوتے ہیں اور اس کو ایسے ہی چھوڑ دینے سے اللہ تعالی قیامت کے روز اس انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے تو اللہ کے جو بندے اللہ سے بچھڑے ہوئے ہیں، اللہ کا حق ادا نہیں کر رہے ہیں اور اپنی جہالت کے سبب جانتے بھی نہیں کہ اللہ کا ہم پر کیا حق ہے تو جو حضرات اللہ کے ان بندوں کے پاس جا جا کر کے ان کو اللہ کے حق سے آگاہ کریں، ان کا تعلق اللہ تعالی کے ساتھ جوڑیں، ان کو دعوت دے کر اللہ کے گھر میں لا کر اللہ کے سامنے کھڑا کریں اور اللہ کے ساتھ اس کا تعلق جوڑیں تو اس پر اللہ تعالی کتنا راضی ہوں گے؟

دعوت وتبلیغ کا سلسلہ۔

دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں یہی تو ہوتا ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچیں تو پھر اس کام کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کسی انسان کی جتنی بھی حاجتیں ہوں، مادی ہوں یا جسمانی ہوں اس میں روحانی حاجت سب سے مقدم ہے۔ اس لیے انسان کو اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرنا، اس کے لیے

آمادہ کرنا، اس کے دل میں اس کے واسطے رغبت پیدا کر کے تیار کرنا، اللہ کے ساتھ اس کا تعلق جوڑنا، یہ سب وہ کام ہیں جس سے اللہ تعالیٰ ایسے راضی ہوں گے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک پر مغفرت۔

مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے میں تو اللہ کا معاملہ اس قدر مہربانی کا ہے کہ جانوروں کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی سفر میں کہیں جا رہا تھا، دورانِ سفر وہ جنگل سے گذر رہا تھا اور اس کو پیاس لگی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک کنواں ہے۔ اس زمانہ میں کنویں کچے ہوا کرتے تھے، اور کنوں میں اندر اترنے کے لیے خانے بنے ہوئے ہوتے تھے، جن میں ہاتھ پاؤں ڈال کر نیچے اترنا ہوتا تھا۔ وہاں ڈول نہیں تھی، اس لیے وہ آدمی اپنی پیاس بجھانے کے لیے خانوں میں ہاتھ پاؤں ڈال کر نیچے اترا اور اپنی پیاس بجھائی۔ اوپر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے کنویں کے پاس پڑی ہوئی گیلی مٹی چاٹ رہا ہے اور بے چین ہے۔ اس نے کتے کی یہ کیفیت دیکھ کر محسوس کیا کہ پیاس کی جو شدت اور تکلیف میں نے محسوس کی تھی یہ جانور بھی اسی سے دوچار ہے۔ یہ سوچ کر اس کو کتے پر رحم آیا، مگر اس کے پاس ڈول رسی تو تھی نہیں اور کوئی برتن بھی نہیں تھا۔ آخر اس نے یہ تدبیر کی کہ چمڑے کے جو موزے پہن رکھے تھے وہ اتارے اور اندر دوبارہ اسی

طرح اترا، موزوں کو پانی سے بھر کر اپنے دانتوں سے پکڑا، چوں کہ ہاتھوں کو تو خانوں میں ڈال کر اوپر چڑھنا تھا اس لیے ہاتھوں سے موزہ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس طرح پانی بھرے ہوئے موزے اوپر لاکر اس پیاسے کتے کو پانی پلایا اور اس کی پیاس بجھائی۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **شکر الله سعیه** اللہ نے اس کی یہ سعی اور کوشش قبول کرلی اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ فرمایا۔

ہر جاندار کے ساتھ بھلائی کرنے پر اجر ہے۔

یہ واقعہ سن کر حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کو بڑا تعجب ہوا کہ ایک کتے جیسا جانور، جس کو لوگ دھتکارتے ہیں، قریب آجائے تو ہم اور آپ بھی اس کو بھگا دیتے ہیں، ایسے جانور کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنے پر اللہ تعالی کی طرف سے جنت کا اور مغفرت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے حضرات صحابہ ؓ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا:

یا رسول الله! أ لنا في البهائم أجر؟ اے اللہ کے رسول! کیا ہمارے لیے جانوروں میں بھی اجر و ثواب ہے؟ یعنی جانوروں کیساتھ اچھا سلوک کریں گے تو اس پر ثواب ملے گا؟ جیسے کہ کتے کو پانی پلایا تو وہ شخص جنت میں چلا گیا؟

نبی کریم ﷺ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں، **في كل ذات كبد رطبة أجر۔** ہر تر جگر والے یعنی ہر جاندار کے ساتھ بھلائی کرو گے تو اللہ تعالی اجر عطا فرمائیں گے۔

مکھی کی پیاس بجھانا مغفرت کا سبب بن گیا

اللہ تعالی کی کسی بھی مخلوق کو آدمی فائدہ پہنچاتا ہے تو اللہ تعالی اس پر راضی ہوتے ہیں۔

کتابوں میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک بہت بڑے عالم تھے اور مختلف طریقوں سے وہ دین کی خدمت انجام دیتے تھے، پڑھنے پڑھانے کا بھی سلسلہ تھا، وعظ و تذکیر کا بھی تھا، دعوت وتبلیغ کا بھی تھا، تصنیف و تالیف کا بھی تھا، مختلف طریقوں سے وہ دین کی خدمت انجام دیتے تھے اور بڑا اونچا مقام تھا۔ ان کا انتقال ہوا تو انتقال کے بعد کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالی تبارک وتعالی نے کیا معاملہ فرمایا۔ انہوں نے فرمایا کہ دوسرے سب اعمال تو ایک طرف رہ گئے، مگر ایک مکھی کی وجہ سے اللہ نے مغفرت فرمادی۔ پوچھا گیا کہ وہ کیسے؟ تو بتایا کہ میں ایک مرتبہ حدیث شریف لکھ رہا تھا، قلم کو روشنائی کے دوات سے نکال کر لکھنے کے لیے کاغذ پر رکھنا چاہتا تھا، اتنے میں ایک مکھی آئی، قلم کی نیب پر بیٹھ گئی اور روشنائی پینے لگی، اپنی پیاس بجھانے لگی۔ میں نے اپنے لکھنے کا عمل روک دیا، سوچا اس کو پی لینے دوں۔ جب وہ اپنی پیاس بجھا کر اڑ گئی تو اس کے بعد میں نے اپنے لکھنے کا عمل شروع کیا۔ اللہ تعالی نے اسی پر میری مغفرت فرمادی۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالی کے یہاں مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی قدر ہے۔ اس لیے جو شخص کسی مومن کی دنیا کی کوئی معمولی تکلیف دور کرے گا، اللہ تعالی قیامت کی بڑی تکلیف اس سے دور فرمائیں گے۔

اس میں ہر نوع کی تکلیف شامل ہے، مادی اور مالی بھی شامل ہے، روحانی بھی ہے، جسمانی بھی ہے۔

جو روایت میں نے پیش کی تھی، اس میں اسی طرح کی چیزوں کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی ہیں۔

تنگ دست اور مصیبت زدہ کو راحت پہنچانا

چنانچہ آگے آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: **من یَسَّرَ علیٰ مُعْسِرٍ یَسَّرَ اللّٰہُ عَلَیْہِ فِیْ الدنیا و الاخرۃ۔**

جو شخص کسی تنگ دست آدمی پر آسانی کرے گا، اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی فرمائیں گے۔

ایک آدمی تنگ دست ہے اور تنگ دستی کی وجہ سے وہ آپ کا حق ادا نہیں کر سکتا، جیسے کہ کسی نے اپنی ضرورت کے واسطے آپ سے کوئی قرض لیا اور اپنے آئندہ کے حالات کے مطابق وعدہ بھی کیا۔ اسکا بیٹا کہیں کما رہا ہے، یا کسی نے اس کو وعدہ کیا ہے کہ آئندہ مہینے میں آپ کو اتنا پیسہ دوں گا، لیکن اِس وقت اُس کو ضرورت ہے، وہ آپ کے پاس آیا اور یہ کہہ کر کہ آئندہ مہینے کی دس تاریخ کو میرے پاس ۵۰۰ روپیے آنے والے ہیں، مگر مجھے ابھی ضرورت ہے، مجھے دوسو روپیے قرض دے دو، اور آپ نے دے دیے۔ اب آئندہ مہینے کی دس تاریخ آئی تو اس کو جس نے وعدہ کیا تھا اس نے نہیں دیے، پیسے نہیں آئے۔ اس کی طرف سے آپ کا قرضہ ادا کرنے کا وعدہ اسی پر تھا، اب وہ ادا کرنے پر قادر نہیں ہے، تو نبی کریم ﷺ

فرماتے ہیں: آپ پٹھانی اوگھرانی (وصولی) مت کرو، بلکہ ذرا مہلت دو۔

مطل الغنی ظلم۔

ایک وہ آدمی ہوتا ہے جو ادا کرسکتا ہے، اس کے پاس مال ہے، اس کے باجود ادانہیں کرتا، اس کے سلسلے میں حدیث میں آتا ہے: **مطل الغنی ظلم**، کہ جو آدمی ادا کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود دیر کرتا ہے تاخیر کرتا ہے، وعدے کے مطابق ادانہیں کرتا تو یہ اس کی طرف سے زیادتی ہے، اس کے ساتھ آپ سختی کا معاملہ کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں؛ لیکن جو آدمی اسباب نہ ہونے کی وجہ سے ادانہیں کرپاتا تو ایسے شخص کو مہلت دینی چاہیے، قرآن میں اللہ تعالی نے سورہ بقرہ میں اسی کا حکم دیا ہے، وہاں یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر آپ معاف کردیں تو بہت اچھا۔

مسلمان کی عیب جوئی اور عیب پوشی

تیسری بات نبی کریم ﷺ نے فرمائی: **من ستر مسلما ستره اللہ فی الدنیا و الآخرة**۔ جو کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا، اس کے عیب چھپائے گا تو اللہ تعالی دنیا وآخرت میں اس کا عیب چھپائیں گے۔

یہ بھی بہت اہم چیز ہے، خاص کر اس زمانے میں ہمارا دیندار طبقہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے، ہم اور آپ اپنے آس پاس اور اپنے ملنے والے بہت سے لوگوں کے متعلق اپنے دلوں میں ناروا جذبات لیے پھرتے ہیں اور ذرا موقع ملا تو کوئی کسی کو چھوڑنے کا نام نہیں لیتا۔ بعض تو باقاعدہ دوسروں کے عیوب معلوم

کرنے کے درپے ہوتے ہیں، حالاں کہ اس پر حدیثِ پاک میں بڑی وعید آئی ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جو لوگوں کے عیب تلاش کرتا ہے، اگر وہ گھر کے اندر بھی کوئی جرم کرے گا تو اللہ تعالی اس کو ظاہر کرے گا اور رسوا کرے گا۔ اس کے لیے تو بڑی سخت وعید ہے ہی۔

لیکن اگر ہم نے کسی کے عیب کو تلاش نہیں کیا، ہمارے اختیار کے بغیر اور ہماری طرف سے کوئی کوشش نہ ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اس کی کوئی بات آ گئی تو شریعت یہ کہتی ہے آپ اس کی پردہ پوشی کریں۔

حضرت عیسی علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے کہا: بتاؤ تمہارا بھائی سویا ہوا ہے، اور ہوا کے ذریعہ اس کا کپڑا اڑ جائے اور اس کے ستر کا کچھ حصہ کھل جائے تو تم کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس کو ڈھانپ لیں گے۔ حضرت عیسی علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ نہیں تم تو اس کو اور زیادہ کھول دو گے۔ اس پر انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! بھلا ایسا کون کرے گا؟ کہا تم ہی تو کرتے ہو؟ تمہارے بھائی کی کوئی بات تمہارے سامنے آتی ہے تو تم ساری دنیا میں اس کو پھیلاتے ہو۔ یہ اس کو برہنہ کرنا اور ننگا کرنا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

مسلمان کی مدد۔

آگے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون أخیہ۔**

اللہ تعالی اپنے بندے کی مدد میں ہوا کرتے ہیں، جب تک بندہ اپنے بھائی

کی مدد میں ہوتا ہے۔ گویا آپ اپنی مشکلات کو حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ اپنے بھائیوں کی مشکلات کو حل کرنے میں لگ جائیں۔

ہمارے اپنے ذاتی بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے قابو سے باہر ہوتے ہیں، ہم اپنے آپ ان مسائل کو حل نہیں کر پاتے، اس کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ اس کی بڑی آسان تدبیر ہے۔ تمہارے بھائیوں کے بھی اسی طرح کے بہت سارے مسائل ہیں، تم خود تو اپنا مسئلہ حل نہیں کر سکتے ہیں، البتہ تمہارے بھائیوں کے اس طرح کے الجھے ہوئے مسائل میں سے بہت سے مسائل کو حل کرنے کی تمہارے اندر طاقت ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: تم اس کا کام کر دو، تو اللہ تعالیٰ تمہارا کام کر دے گا۔ کتنا آسان طریقہ ہے۔

مسلمان کی دینی خیر خواہی۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کی جو تاکید فرمائی ہے اسی کا اولین اور عظیم شعبہ یہ ہے کہ ہم دین کی نسبت سے اپنے بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ خیر خواہی کریں۔ اپنی اصلاح، اپنی فکر اور اپنے آپ کو دین سکھانے کے ساتھ اپنے جو بھائی دین سے بے خبر ہیں اور دینی احکام سے ناواقف ہیں، اللہ تعالیٰ سے کٹے ہوئے اور اللہ سے دور ہیں، اپنے ماحول میں جن کو علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، کسی نے ان کو آگاہ نہیں کیا، اللہ کے ایسے بندوں کو اللہ کی طرف دعوت دی جائے، تو یہ بھی ان کے ساتھ بہت بڑی شفقت اور مہربانی ہے۔

اللہ سے کٹے ہوئے بندوں کو اللہ تعالی کے ساتھ جوڑا جائے، ان میں دین کی طلب نہیں ہے تو بھی ان کے پاس جا جا کر ان کو سمجھا کر ان کو آمادہ کر کے، ان کو ترغیب دے کر ان میں بھی دین کی طلب پیدا کی جائے۔ اس کے نتیجہ میں وہ لوگ اللہ سے جڑ جائیں تو اس پر جو اللہ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل ہوگی، اس کا آدمی اندازہ نہیں لگا سکتا۔

بیش قیمت دولت سے بھی زیادہ قیمتی ثواب۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک قلعہ کئی روز سے فتح نہیں ہو رہا تھا، رات کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کل صبح میں ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ رات کو تمام صحابہؓ اسی کے متعلق چہ می گوئیاں کرتے رہے کہ دیکھیں صبح کس کے نام کا قرعہ نکلتا ہے؟ اور یہ سعادت کس کے مقدر میں آتی ہے؟ چنانچہ صبح کو دیکھا گیا کہ سب بڑے بڑے صحابہ حضور ﷺ کی آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں اور چکر مار رہے ہیں کہ کہیں ہم نظر آ جائیں اور ہمیں بلا لیا جائے۔ حضرت عمرؓ جیسا آدمی کہتا ہے کہ میں نے کبھی زندگی میں امارت اور سرداری کی خواہش نہیں کی، سوائے اس دن کے۔ اس لیے کہ اس دن جس کے ہاتھ میں جھنڈا دیا جانے والا تھا، اس کے متعلق حضور ﷺ پہلے ہی فرما چکے تھے کہ اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں؛ گویا اس سرداری اور جھنڈا ملنے پر یہ انعام ملنے والا تھا۔

مگر حضور ﷺ کو جس سے کام لینا تھا وہی صحابی وہاں نہیں تھے، اس لیے آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: علی کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ ان کی تو آنکھوں میں تکلیف ہے، اس لیے اپنی قیام گاہ پر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بلاؤ انہیں، چنانچہ بلائے گئے۔

چوں کہ ان کی آنکھوں میں درد تھا اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک ان کی آنکھوں میں ڈالا تو یہ درد ختم ہو گیا اور ایسا ختم ہوا کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ پھر زندگی بھر کبھی آنکھ میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے بعد پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو جھنڈا دے کر فرمایا:

جاؤ اور قلعہ فتح کرو۔

حضرت علیؓ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! جا کر ان سے لڑوں؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں۔ پہلے ان کو ایمان و اسلام کی دعوت دو۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ، **لأَنْ یَهْدِیَ اللّٰهُ بِکَ رجُلاً خَیْرٌ لَکَ مِن حُمُرِ النَّعَم**، اے علی! آپ کے ذریعہ اللہ تعالی اگر ایک آدمی کو ہدایت دے دے تو اس کا ثواب تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

اس زمانہ میں سرخ اونٹ بڑا قیمتی مال سمجھا جاتا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری وجہ سے اگر کسی کو ہدایت مل جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی اس نعمت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ضرورت ہے آج کی اس دنیا میں ان چیزوں پر محنت کی جائے اور ہم اپنی صلاحیتوں کو، اور اللہ تعالی نے صحت، مال اور عمر اور فراغت کی جو نعمت ہم کو عطا فرمائی ہے، اس نعمت کو ایسے کاموں میں استعمال کریں، یہی اس کا صحیح استعمال ہے۔

پانچ کاموں کی پانچ مہلتیں۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: **اغتنم خمسا قبل خمس**، پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔

(۱) **شبابک قبل هرمک**، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے۔

جوانی رہنے والی نہیں ہے۔ اس لیے جوانوں کو کہا جاتا ہے کہ ان کو اللہ تعالی نے موقع دیا ہے، بڑی صلاحیتیں دی ہیں، ان کو کھیل کود میں ضائع نہ کر دو، ادھر ادھر نفس پرستی میں، خواہشات میں، غلط چیزوں میں برباد نہ کرو، بلکہ اللہ کے لیے استعمال کرو۔

صحتک قبل سقمک: اپنی تندرستی کو بیماری سے پہلے۔

غنائک قبل فقرک، مالداری کو فقیری سے پہلے۔

فراغک قبل شغلک، فرصت کو مشغولی سے پہلے۔

کبھی ایسی مشغولی کاروبار میں آجاتی ہے کہ آدمی چاہتا بھی ہے کہ کچھ وقت نکالے، مگر وقت نہیں نکال سکتا۔ آج کل (تعطیلات، Vacation) کے اوقات فراغت کے ہیں، ہمارے امیر صاحب آج کل خاص محنت کر رہے ہیں، اب آگے مئی جون کے مہینے آرہے ہیں، پھر بارش کا زمانہ آئے گا، یہ فرصت کا زمانہ ہے، اس لیے چار مہینے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ ان فرصت کے اوقات کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھو۔

حیاتک قبل موتک، زندگی کو موت سے پہلے۔

ایک سبحان اللہ اگر اللہ تعالی ہماری زبان سے ادا کروا دے، تو یہ ہمارے لیے سارے جہاں کی دولت سے بڑھ کر ہے، دنیا کی کوئی دولت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بہر حال! اس سلسلے میں جو توجہ دلائی جارہی ہے اس کو سن کر اس پر بھی لبیک کہیں، اس میں مسلمان بھائیوں کی دینی اور روحانی ضرورت کو پورا کرنے کا بھی ثواب ہے، ہدایت کا ذریعہ بننے کا بھی ثواب ہے اور اپنی جوانی، مال، اوقات، تندرستی اور زندگی کی نعمتوں کا شکریہ بھی ہے۔

مصارف میں اخلاصِ نیت اور احتساب کمالِ ایمان کی علامت ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر اپنے رشتے داروں کے ساتھ جتنے بھی معاملے کیے جاتے ہیں وہ رسم و رواج میں کھو جاتے ہیں۔ حالاں کہ صلہ رحمی کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ رشتے داروں کے حقوق کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور اس پر بڑے اجر و ثواب کا وعدہ ہے؛ لیکن ہم نے اپنے آپ کو رسم و رواج کا پابند بنا کر ان ساری بھلائیوں کو اسی خانے میں ڈال دیا۔ اللہ کے لیے کیے جانے والے اعمال رسم و رواج کے تابع کر دیے۔

عنوانات

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا۔ من يهديه الله فلا مضل له و من يضلله فلا هادى له۔ و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و نشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده و رسوله۔ أرسله إلى كافة الناس بشيرا و نذيرا و داعيا إلى الله بإذنه و سراجاً منيرا، صلى الله تعالى عليه و على آله و أصحابه و بارک و سلم تسليماً كثيراً كثيراً۔ أما بعد۔

فقد قال رسول الله ﷺ من أعطى لله و منع لله و أحب الله و أبغض لله فقد استكمل إيمانه (معجم كبير طبرانی: ۱۶۸۴۶، ابو داؤد: ۴۰۶۳)

محترم حضرات!

یہ حضور اکرم ﷺ کا ایک ارشاد ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

من أعطى لله: جس آدمی نے اللہ کے لیے دیا، یعنی کوئی چیز کسی کو دی، مال خرچ کیا، وہ سب اللہ کے لیے خرچ کیا۔ و منع لله: اور خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ کو روکا، کسی کو نہیں دیا، وہ بھی اللہ کے خاطر نہیں دیا۔ و أحب لله: اور کسی کے ساتھ محبت رکھی، تعلق رکھا وہ اللہ کے واسطے رکھا۔ و أبغض لله: اور کسی کے ساتھ دشمناوٹ کی، قطع تعلق کیا، وہ بھی سب اللہ کے خاطر کیا۔ فقد استمکل إيمانه: اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

کمالِ ایمان کی چار علامات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمال ایمان کی چار علامتیں اور نشانیاں اس حدیث میں ذکر فرمائی ہیں۔

ان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آدمی جو کچھ مال خرچ کرے وہ اللہ ہی کے لیے کرے۔ عام طور پر ہم جو خرچ کرتے ہیں ان میں ایک تو صدقے اور خیرات کے طور پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر نیت صحیح ہے، شہرت اور دکھلاوا مقصود نہیں اور ریا ونمود مطلوب نہیں ہے تو سب لوگ عام طور پر صدقہ اور خیرات میں اللہ ہی کے خاطر خرچ کرتے ہیں؛ لیکن آدمی کبھی اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، اپنے کھانے کے لیے، اپنے پہننے اوڑھنے کے لیے اور اپنی ضرورتوں کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے گھر والوں کے لیے اور بیوی کے لیے خرچ کرتا ہے، ان کے کھانے، پہننے، اوڑھنے اور ان کی ضروتوں کے لیے نیز اپنی اولاد کے کھانے، پینے، ان کے پہننے، اوڑھنے اور ضرورتوں کے لیے جو خرچ کرتا ہے اور دیتا ہے، اس میں اللہ کے واسطے دینا اور خرچ کرنا کیسے ہوگا؟ یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

لیکن اگر کوئی آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کی ہدایتوں سے واقف ہے تو اس کے یہ سارے کام بھی اللہ کے لیے بن سکتے ہیں، اس لیے کہ اپنی ذات اور جسم پر جو خرچ کرے گا، جیسے اگر بھوکا ہے تو جسم کو بچانے کے لیے کھائے، جان کی حفاظت کے لیے کھائے پیئے، پہنے اور اوڑھے وغیرہ، یہ سب جسم کے لیے

ہی ہے، اور جسم اللہ کی ایک نعمت ہے جو ہمارے پاس امانت ہے۔

انسان اپنے جسم کا مالک نہیں۔

ہم اپنے جسم کے مالک نہیں، یہ تو اللہ تعالی نے ایک مقررہ وقت کے لیے، جب سے ہم پیدا ہوتے ہیں وہاں سے لے کر وفات تک، جب تک ہمارا دنیا میں رہنا اللہ کو منظور ہے وہاں تک؛ ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔ ہم اس کو اسی طرح استعمال کر سکتے ہیں، جیسا اللہ تعالی نے ہمیں حکم دیا ہے اور اجازت دی ہے۔ اور جس طریقے سے منع فرمایا اس طرح ہم استعمال نہیں کر سکتے۔

اس جسم میں آنکھیں ہیں، ان آنکھوں سے ہم ان ہی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں جن کو دیکھنے کی اللہ تبارک تعالی نے اجازت دی یا حکم دیا اور جن چیزوں کے دیکھنے سے اللہ تبارک وتعالی نے منع فرمایا ہو، مثلاً نامحرم عورتوں کو نہ دیکھو، بے ریش لڑکوں کو نہ دیکھو، تو اب ہمیں اس طرح دیکھنے کا حق نہیں۔ ہم مالک نہیں کہ جسم کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، جس چیز کو چاہیں ان آنکھوں سے ہم دیکھیں۔ ہمیں اس سلسلے میں باقاعدہ پابند کر دیا گیا ہے۔ ان آنکھوں کے سلسلے میں ہمیں اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے صریح احکامات دیے گئے ہیں، فلاں چیز دیکھ سکتے ہو ،فلاں چیز نہیں دیکھ سکتے ہو، فلاں چیز کے دیکھنے پر ثواب ملے گا اور فلاں چیز کے دیکھنے پر آپ کو گناہ ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ یہ آنکھیں امانت ہیں، یہ زبان امانت ہے، یہ کان امانت ہیں، ہاتھ امانت ہیں، انسان کے جسم میں اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے جتنے بھی اعضاء

استعمال کے لیے دیے گئے ہیں، وہ سب ہی امانت ہیں، انسان ان کا مالک نہیں کہ اپنی مرضی اور اختیار کے مطابق جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے۔ اسی لیے اگر کوئی آدمی مرتے وقت وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد میری آنکھیں آئی بینک میں جمع کر دی جائیں، اور آپ اس کے متعلق مفتیوں سے مسئلہ پوچھیں گے تو آپ کو جواب ملے گا کہ ایسی وصیت کرنے کی اجازت نہیں ہے، ایسی وصیت باطل ہے اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ یہ آنکھیں اللہ کی دی ہوئی امانت تھی، اس میں اس طرح کا تصرف کرنا انسان کے لیے درست نہیں۔

ہم یوں سمجھیں کہ جسم کے ہم مالک ہیں اور آدمی چاہے تو اپنی مرضی سے اپنی جان دے دے، کوئی آدمی چھری سے اپنا گلا کاٹ لے، یہ سب حرام ہے۔ آخر کیوں یہ حرام ہے؟ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدمی نے اپنی جان دی، چھری سے اپنا ہی گلا کاٹا ہے، پھر کیوں اس کو گنہ گار قرار دیا جاتا ہے، جواب یہ ہے کہ اس لیے کہ یہ جان اس کی نہیں تھی، اللہ کی امانت تھی، اور اس نے چھری سے اپنا گلا کاٹ کر اس امانت میں خیانت کی ہے، اس لیے یہ شخص بہت بڑا گنہ گار ہے۔ ایسی موت کو حرام موت سے مرنا کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے، یہ اللہ تعالی کی امانتیں ہیں اور ہمیں اس میں اتنا ہی تصرف کرنے کا اور اتنا ہی استعمال کا اختیار ہے جتنا اللہ تعالی کی طرف سے حکم دیا گیا ہو یا اجازت دی گئی ہو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جسم کے ہم مالک نہیں، یہ تو سرکاری مشین ہے، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ڈالی گئی ہے۔ ایک آدمی کے پاس کھانا ہے، بھوک لگی

ہے؛ لیکن کھانا نہیں کھا رہا ہے، یہاں تک کہ بھوک سے مر گیا تو مسئلہ یہ ہے کہ یہ اس کی حرام موت ہے، اس کے لیے ضروری اور فرض تھا کہ کھانا کھا کر اپنی جان کی حفاظت کرتا؛ اگر وہ انسان خود اپنے جسم کا مالک ہوتا تو اس کی موت کو حرام موت نہ کہا جاتا۔

جسم اللہ تعالی کی مشین ہے۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہ کے یہاں ساری چیزوں کے ٹائم لکھے ہوتے تھے۔ دوائی لینے کا بھی ٹائم لکھا ہوتا تھا، گیارہ بج کر تیس منٹ کو فلاں دوائی، گیارہ بج کر چالیس منٹ پر فلاں کام، اور اس کے مطابق ہی سارا نظام چلتا تھا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہم اس جسم کے مالک نہیں، یہ تو سرکاری مشین ہے، اس میں ذرا بھی گڑبڑ ہوگی تو وہاں پوچھ ہوگی کہ تم نے کیوں ہماری مشین خراب کر دی، کیوں اس میں گڑبڑ کر دی؟

جب جسم اللہ کی امانت ہوئی تو اب اس جسم پر جو کچھ ہم خرچ کریں گے اور اسی نیت سے خرچ کریں گے کہ اس کی ہم حفاظت کر رہے ہیں تو گویا ہم اللہ کے حکم کو پورا کر رہے ہیں اور یہ نیکی کا کام کر رہے ہیں، اپنی خواہش نہیں پوری کر رہے ہیں۔

حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو درداءؓ کا قصہ

إن لنفسك عليك حقا

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو صحابی: حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابو درداءؓ

تھے، ان دونوں کے درمیان نبی کریم ﷺ نے عقد مواخات کرایا تھا اور دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا۔

ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ اپنے بھائی حضرت ابودرداءؓ کی خیر خبر معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے، جب یہ پہنچے تو گھر پر حضرت ابودرداءؓ موجود نہیں تھے، ان کی بیوی کو دیکھا کہ بہت بوسیدہ اور میلے کپڑوں میں ہے۔ ایک عورت کا شوہر گھر پر موجود ہو اور وہ میلے کچیلے کپڑوں میں رہے، آخر کیا بات ہے؟ عورت کو تو حکم دیا گیا ہے کہ شوہر کی موجودگی میں اپنے آپ کو شوہر کے لیے مزین رکھے۔

حضرت سلمان فارسیؓ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ آپ کے بھائی ابودرداء کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، وہ تو دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر عبادت کرتے ہیں، گویا میں بھی دنیا ہی کا ایک حصہ ہوں اس لیے میرے ساتھ ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔

جب حضرت ابودرداءؓ گھر پر آئے، دیکھا کہ بھائی آئے ہیں اور حضور کے بنائے ہوئے بھائی ہیں تو ان کے لیے باقاعدہ کھانا پکوایا اور کھانا ان کے سامنے رکھ کر کہا تم کھاؤ، میرا تو روزہ ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا تم بھی بیٹھو میرے ساتھ، روزہ کھول دو۔

ایک مسئلہ یہاں علماء نے بتلایا ہے کہ اگر کسی آدمی نے نفل روزہ رکھا، اور وہ خود کسی کے یہاں مہمان ہے اور میزبان یوں کہتا ہے کہ آپ کو کھانا ہی پڑے گا تو اس صورت میں مہمان کو بھی چاہیے کہ میزبان کی خوشنودی کے لیے روزہ توڑ

دے۔ اگر وہ کہے کہ میرا روزہ ہے، میں دعا کر لیتا ہوں اور میزبان راضی ہوجاتا ہے تو پھر کوئی حرج نہیں۔ روزہ رہنے دے؛ لیکن اگر وہ کہے کہ آپ کو کھانا ہے، آپ کے لیے تو اتنا سارا اہتمام کیا، آپ نہیں کھائیں گے تو کیسے چلے گا؟ تو پھر اس کو کھانا چاہیے، روزہ توڑ دینا چاہیے، بعد میں قضا کر لے۔ اسی طریقے سے میزبان روزے سے ہے اور مہمان اصرار کرتا ہے کہ میں نہیں کھاؤں گا جب تک کہ آپ نہیں کھائیں گے، اور نفل روزہ ہے تو میزبان کو بھی توڑ دینا چاہیے۔

بہر حال حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابودرداءؓ کو بیٹھا دیا اور روزہ تڑوا دیا۔ کھانا کھا چکے اس کے بعد جب رات ہوئی تو حضرت ابودرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے بستر بچھایا کہ آپ آرام کیجیے، میں تو اپنی نماز میں لگتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، تم بھی سو جاؤ، اور یہ کہہ کر ان کو سلا دیا۔ تھوڑا وقت گذرنے کے بعد انہوں نے اٹھنا چاہا تو پھر سلا دیا، رات کا ایک تہائی حصہ جب باقی رہ گیا تو حضرت سلمان فارسیؓ خود بھی اٹھے اور حضرت ابودرداءؓ سے کہا کہ آپ بھی اٹھیے اور اب نماز میں لگیے۔ جب صبح ہوئی تو حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابودرداءؓ کو ایک نصیحت کی کہ **إن لربک علیک حقا وإن لنفسک علیک حقا وإن لأهلک علیک حقا فأعط کل ذی حق حقه۔ (بخاری، کتاب الصوم، باب من أقسم علی أخیه لیفطر)**

یعنی تمہارے پروردگار کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری ذات کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔

یہ قصہ تو ابھی ان دونوں حضرات کے درمیان پیش آیا تھا؛ اور ابھی اس پر نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مہر تصدیق نہیں لگی تھی اور جب تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس کی تصدیق نہ کر دی جائے، یہ چیز شریعت نہیں بن سکتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی دنیا میں موجود تھے، چنانچہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، صدق سلمان، سلمان نے صحیح کہا۔

تصحیح نیت سے دنیا بھی دین بن جاتی ہے۔

دیکھئے! اس سے معلوم ہوا کہ یہ آرام کرنا، اپنے جسم کو راحت پہنچانا اور کھانا کھلانا وغیرہ امور یہ سوچ کر ہوں کہ اللہ نے یہ حق رکھا ہے اور ہمیں یہ حق ادا کرنا ہے، تو یہ کھانا بھی عبادت اور ثواب ہے، اس نیت سے سوئیں گے اور آرام کریں گے تو یہ سونا بھی عبادت اور ثواب ہے۔ بیوی کا حق ہے اس نیت سے بیوی کے ساتھ صحبت کریں گے تو صحبت کرنے میں بھی ثواب ہے، اس کے ساتھ بات چیت کریں گے یہ سمجھ کر کہ اس کا حق ہے تو یہ بات چیت کرنا بھی ثواب ہے۔ فقط نماز کے لیے نیت باندھ کر کھڑا ہونا ہی عبادت نہیں، یہ سب دوسرے کام بھی عبادت ہیں۔

حضرت عمرو بن عاص اور عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا قصہ

ایک دوسرا قصہ اسی نوع کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔
حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، ان کے بیٹے تھے حضرت

عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ۔ ان دونوں باپ بیٹے کی عمر میں بارہ سال کا فرق تھا، یعنی بیٹے اپنے باپ سے فقط بارہ سال چھوٹے تھے۔

انہوں نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا نکاح کرایا، نکاح کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمرو بن عاص ؓ نے اپنی بہو سے یعنی بیٹے کی بیوی سے بیٹے کے متعلق پوچھا کہ ان کا معاملہ کیسا ہے؟

معلوم ہوا کہ باپ کو نکاح کرا کے بیٹھ جانا نہیں چاہیے، ذرا دیکھ بھال کرنی چاہیے کہ بیٹا بیوی کا حق ادا کرتا ہے یا نہیں۔

بیوی نے کہا کہ عبداللہ بڑے اچھے آدمی ہیں، رات بھر قیام کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں، ان کو دنیا سے کچھ رغبت نہیں۔ حضرت عمرو بن عاص ؓ سمجھ گئے کہ کیا کہنا چاہتی ہے، مگر وہ کچھ دن ٹھہر گئے کہ شاید ان کو ذرا خیال آجائے۔ کچھ دنوں کے بعد دوبارہ تحقیق کی تو بہو کی طرف سے یہی جواب ملا۔ انہوں نے سوچا کہ معاملہ اس طرح نہیں سدھرے گا، فہمائش کی ضرورت ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں باپ خود اس سلسلے میں بیٹے سے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا، دوسرے بڑوں کو بیچ میں ڈالا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمرو بن عاص ؓ نے نبی کریم ﷺ سے جا کر کے شکایت کی کہ میں نے تو ایک شریف گھرانے کی عورت کے ساتھ عبداللہ کا نکاح کرادیا؛ لیکن ان پر تو عبادت کا ایسا جذبہ سوار ہے کہ بس دن بھر روزہ رکھتے ہیں، رات بھر عبادت کرتے ہیں، قرآن کی تلاوت، نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ ایک موقع دیکھ کر ان کے یہاں تشریف لے گئے، اور پھر ان سے پوچھا **ألم أخبر أنک تقوم النهار و تصوم اللیل**، بھائی! مجھے بتایا گیا ہے کہ تم دن بھر روزہ رکھتے ہو اور رات بھر عبادت کرتے ہو۔

اس روایت کے راوی خود حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ **قلت بلی، یا رسول اللہ**، جی ہاں۔ اے اللہ کے رسول، آپ کو جو اطلاع ملی ہے وہ صحیح ملی ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا:

لا تفعل، صم و أفطر، وقم و نم، فإن لجسدک علیک حقا وإن لعینیک علیک حقا وإن لزوجک علیک حقا وإن لزورک علیک حقا (بخاری شریف، کتاب الادب، باب حق الضیف)

ایسا نہ کرو، روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، کچھ دن روزے تو کچھ دن افطار کرو، رات کا کچھ حصہ آرام کرو اور کچھ حصے میں عبادت میں لگو۔

ہمارا حال صحابہ سے برعکس ہے۔

ہمارا معاملہ برعکس ہے، ہم رات بھر سوئے رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے لیے بھی اس میں بایں معنی ہدایت ہے کہ اس میں قم بھی ہے اور صم بھی ہے، وہاں وہ معاملہ تھا اور یہاں ہمارا حال یہ ہے۔

ہمارا حال تو ایسا ہے کہ کوئی ہمیں ہدایت کرے کہ کبھی کچھ تہجد وغیرہ بھی پڑھ لیا کرو، کچھ عبادت کا خیال رکھو، تو کہتے ہیں کہ **إن لجسدک علیک حقا**، جسم کا بھی کچھ حق ہے بھائی! یعنی ابھی جسم کا حق ادا نہیں کر پائے ہیں، اور زیادہ سوئیں

گے تب جسم کا حق ادا ہوگا۔ ہم اپنی زبان حال سے یوں کہنا چاہتے ہیں۔

بہر حال کہنے کا حاصل یہ ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمہاری زیارت اور ملاقات کے لیے آنے والے آدمی کا بھی تم پر حق ہے، اور ہر ایک کا حق ادا کرنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جسم پر جو کچھ خرچ کر رہا ہے اس میں وہ اللہ کا حکم ہی پورا کر رہا ہے۔

اصل چیز اخلاص نیت ہے۔

لیکن ایک بات یاد رکھو! اس کا تعلق آدمی کی نیت اور ارادے سے ہے، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے خالص عبادت کے کاموں کو بھی عبادت کے خانے سے نکال کر اپنی ضرورتوں میں ڈال دیا ہے۔

نماز جیسی نماز عبادت کا بھی ثواب اس وقت ملے گا جب اللہ کے لیے ادا کی جائے، نماز میں اگر دوسری نیت آ گئی، مثلاً ایک آدمی نماز اس لیے پڑھتا ہے کہ نماز میں بڑی اچھی ورزش ہے، اسے کسی نے بتلایا کہ نماز میں ایسی ورزش ہو جاتی ہے کہ سارے اعضاء تندرست رہتے ہیں اور اس نے نماز شروع کر دی، تو گرچہ اس کا فرض ادا ہو جائے گا لیکن اس نماز پر ثواب ملنے کا سوال ہی نہیں، ثواب نہیں ملے گا۔

خالص عبادتوں کا حکم یہ ہے کہ ثواب اسی وقت ملے گا جب آدمی ان کاموں کو اللہ کے خاطر انجام دے، اس میں کوئی دوسری نیت شامل ہوگئی، دکھلاوا شامل ہو

گیا، شہرت شامل ہوگئی، تو اونچے سے اونچا عمل بھی اللہ کے یہاں قبول نہیں ؛ بلکہ اس پر بجائے ثواب کے عذاب ہوگا، جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی مشہور روایت ہے کہ قیامت میں سب سے پہلے حساب کے لیے تین آدمیوں کو بلایا جائے گا، ایک قاری قرآن، ایک مالدار جو خرچ کرتا رہتا تھا اور تیسرا شہید؛ ان تینوں کے اندر کیا کمی تھی، بہت کچھ کیا، لیکن نیت درست نہیں تھی، اس لیے عبادت عبادت نہ رہی ؛ بلکہ عذاب بن گئی۔

بہر حال یہاں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ نسخہ بتلایا ہے کہ ہماری طبعی ضرورتیں بھی عبادت بن جائیں۔ انسان کے اپنے طبعی تقاضوں کی وجہ سے، کھانا پینا، سونا، بیوی کے حقوق ادا کرنا، بیوی کے ساتھ صحبت کرنا، اولاد کے ساتھ محبت کرنا، وغیرہ سارے امور کے متعلق حضور نے ایسا طریقہ کو بتلایا ہے کہ وہ ہمارے لیے عبادت بن جائے۔

حضرت سعدؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصیحت۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہوئے، اس وقت ان کی ایک صاحب زادی ہی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ! آپ میرا حال دیکھ رہے ہیں، میں تو بالکل موت کے کنارے کھڑا ہوں، میرے پاس جو مال ہے، اس کے وارثوں میں ایک بیٹی ہی ہے، یعنی سیدھی اولاد کے اعتبار سے، ویسے دوسرے عصبات اور خاندان کے اور لوگ تھے، لیکن اپنے یہاں بولتے ہیں اس کے مطابق سیدھی لائن

کے وارثین میں وہ ایک بیٹی ہی تھی۔ انہوں نے اس وقت عرض کیا کہ آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے پورے مال کی وصیت کروں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں۔ انہوں نے کہا دو تہائی؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ انہوں نے کہا: آدھا مال؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، آخر میں انہوں نے کہا کہ ایک تہائی کی وصیت کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں ایک تہائی کی کر سکتے ہو لیکن وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ الثلث کثیر۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ **إنک إن تذر ورثتک أغنياء خير من أن تذرهم عالة يتكففون الناس**۔ تم اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ فقیر ہوں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔

پھر آگے ایک بات فرمائی:

وإنک لن تنفق نفقة تبتغي بها وجه الله إلا أجرت حتى ما تجعل في في امرأتك۔ (مؤطا مالک، کتاب الوصیة ۱۴۹۵/بخاری کتاب النفقات: ۵۰۳۹)

تم جو کچھ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خرچ کرو گے اس پر تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ بیوی کے منہ میں ڈالو گے اور اس میں بھی تمہاری نیت اللہ کا حکم پورا کرنے کی ہے تو اس میں بھی تم کو ثواب ملے گا۔

نیت میں تبدیلی کیسے آئے گی؟

مگر اس کے لیے اپنے ارادے میں تدبیلی لانے کی ضرورت ہے، ارادے کی تبدیلی ایک دن میں حاصل نہیں ہوتی۔ اہل اللہ کے یہاں رہ کر یہی چیز سیکھی جاتی ہے، ہم اپنے افعال کو کیسے اللہ کے لیے بنائیں، ان کی صحبت میں اسی چیز کو

سیکھا جاتا ہے، ظاہری اعتبار سے جواہل اللہ ہیں وہ بھی وہی کام کرتے ہیں جو ہم کرتے ہیں، ہم بھی کھاتے پیتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، ہم بھی اپنے گھر والوں کا حق ادا کرتے ہیں اوروہ بھی اپنے گھر والوں کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ آرام کرتے ہیں، ہم بھی کرتے ہیں۔ وہ بھی بچوں کے ساتھ محبت کرتے ہیں، ہم بھی کرتے ہیں؛ لیکن وہ حضرات جو کام بھی کرتے ہیں وہ سب ان کی نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں، اور ہمارے اندر یہ کیفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی، اس لیے احتساب بہت ضروری ہے۔

ابومسعودانصاریؓ اورمقدام بن معدی کرب کی روایت

حضرت ابومسعود انصاریؓ کی روایت ہے کہ إذا أنفق الرجل علی أهله نفقةو هو یحتسبها فهی له صدقة، (بخاری، کتاب الایمان: ۵۴) جوآدمی اپنے گھر والوں پر خرچ کرے، اورخرچ کرنے میں اس کی نیت اللہ کا حکم پورا کرنے کی اور اللہ کوراضی کرنے کی ہوتو وہ بھی صدقہ ہے۔

حضرت مقدام بن معدی کرُبؓ کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما أطعمت نفسک فهو لک صدقة و ما أطعمت ولدک فهو لک صدقة وما أطعمت زوجتک فهو لک صدقة وما أطعمت خادمک فهو لک صدقة۔ (الأدب المفرد: ۸۱/باب مسند احمد بن حنبل، مسند الشامیین: ۱۶۸۴۸)

تم جواپنے کوکھلاتے ہووہ بھی صدقہ، جواپنی اولادکوکھلاؤ وہ بھی صدقہ، جواپنی

بیوی کوکھلاؤ گے وہ بھی تمہارے لیے صدقہ اور جو اپنے خادم کو دو گے وہ بھی صدقہ۔

زیادہ اجروثواب والاخرچ

بلکہ یوں سمجھئے کہ گھر والوں پر جوخرچ کیا جاتا ہے وہ فرض اور واجب کا درجہ رکھتا ہے، مسلم شریف میں روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشاد فرمایا:

دینار أنفقته فی سبیل اللہ و دنیار أنفقته فی رقبة و دنیار تصدقت به علی مسکین و دینار أنفقته علی أهلک أعظمها أجراً الذی أنفقته علی أهلک ۔(مسلم شریف کتاب الزکوة، باب فضل النفقة علی العیال:۱۶۶۷)

ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہو، ایک دینار وہ ہے جو تم مسکین پر صدقہ کرو، ایک دینار وہ ہے جو کسی غلام کو آزاد کرنے میں خرچ کرو اور ایک دینار وہ ہے جو اپنے گھر والوں پر خرچ کرو، ان میں سب سے افضل وہ دینار ہے جو تم نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا، یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کیے گئے مال کے مقابلہ میں یہ افضل ہے اور اس کا ثواب زیادہ ہے۔ وجہ صاف ہے کہ گھر والوں کا نفقہ آدمی پر اللہ تبارک تعالی کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ تو واجب کا درجہ رکھتا ہے اور مسکین اور فقیر کو دینا نفل کا درجہ رکھتا ہے اور ہر آدمی جانتا ہے کہ واجب اور فرض کا مقام نفل سے بڑھ کر ہے۔

بہر حال میں عرض کر رہا تھا کہ جو دے وہ اللہ کے واسطے دے، جو کچھ خرچ کرے وہ اللہ کے واسطے خرچ کرے، تو اس کا خرچ کرنا بھی دین ہی ہے، دنیا نہیں۔ اور دین و دنیا میں فرق صرف زاویۂ نگاہ کا ہے، آدمی اپنی سوچ اور زاویۂ نگاہ

بدل دے، تو جس کو ہم دنیا سمجھ رہے ہیں وہی دین بن جائے گا۔

نقطۂ نظر کو بدلنے کی ضرورت۔

لینے دینے میں، اور محبت اور عداوت کے بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں کہ ان میں آدمی یہ سوچتا ہی نہیں کہ یہ اللہ کے حکم کی فرماں برداری ہے، اور پھر اس میں نفس کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ جب ان چیزوں کو نفس کی آمیزش سے بچائے گا تو دوسرے کاموں میں نفس کی آمیزش سے بچانا اس کے لیے بہت آسان ہے۔

بہر حال یہ سب دین بن سکتا ہے، صرف نقطۂ نظر کو ٹھیک کرنے اور بدلنے کی ضرورت ہے۔

ہم جو کریں وہ اللہ کے لیے کریں، اپنے نفس کے لیے نہ کریں۔ یہ ہے فرق دین اور دنیا میں۔ نظریہ بدل جانے سے دنیا بھی دین بن جاتی ہے اور اس کے بدل جانے سے دین بھی دنیا بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں وہ کیفیت عطا فرمائے کہ ہم سب کچھ اللہ ہی کے لیے کرنے والے بن جائیں۔

یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ، حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ کے خلیفہ تھے، فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! دین اور دنیا میں یہی ایک فرق ہے، زاویۂ نگاہ بدل دینے کا، اگر آپ اپنی بیوی پر خرچ کر رہے ہیں، اپنی لذت حاصل کرنے کے لیے، اپنے نفس کو راحت پہنچانے کے لیے تو یہ دنیا کہلاتا ہے، ہر

آدمی اسی طرح خرچ کرتا ہے۔ اور اگر اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے خرچ کرو گے تو یہ دین بن جائے گا، ظاہری اعتبار سے دونوں عمل ایک ہے، جو اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے خرچ کرتا ہے وہ بھی بیوی کو کھلا پلا رہا ہے، اور جو لذت اندوزی کے لیے، نفس پرستی کے لیے خرچ کر رہا ہے وہ بھی کھلا پلا رہا ہے؛ لیکن نیت میں فرق ہونے کی وجہ سے دونوں کا حکم بدل گیا۔

ہم اور آپ بھی سوتے ہیں اور ہمارا مقصد ہوتا ہے کہ سو کر ہم اپنے نفس کی خواہش پوری کریں ؛ لیکن اگر یہ سونا اس نیت سے ہو کہ اللہ تعالی نے یہ جسم عطا فرمایا ہے ہم ذرا اس کو آرام دے دیں تا کہ وہ اللہ تعالی کے احکام کو پھر دوبارہ چاق و چوبند ہو کر پورے نشاط اور فریش ہو کر ادا کر سکے، تو ظاہر ہے کہ یہی سونا عبادت بن جائے گا۔

نینداور نماز دونوں برابر۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا۔ ایک حصے کا حاکم ایک کو بنایا دوسرے حصے کا حاکم دوسرے کو بنایا۔ اور دونوں کو ہدایت کی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے ملاقات بھی کرتے رہیں، چنانچہ دونوں کا معمول تھا کہ دونوں میں سے ہر ایک جب اپنے علاقہ کے دورے پر نکلتا اور دوسرے کی جائے قیام قریب ہوتی تو وہ ان سے مل لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنے علاقے کے دورے پر نکلے تو حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے پہنچے، بہت ساری باتیں ہوئیں، اس میں ایک یہ بھی تھی کہ حضرت

معاذ ؓ نے حضرت ابو موسی اشعری ؓ سے پوچھا کہ تم قرآن کس طرح پڑھتے ہو، انہوں نے کہا کہ میرا روزانہ قرآن پڑھنے کا جو معمول ہے وہ میں رات اور دن میں چلتے پھرتے پورا کر لیتا ہوں۔ پھر حضرت ابو موسی اشعری ؓ نے حضرت معاذ ؓ سے پوچھا کہ آپ کا معمول کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں رات کے شروع حصے میں آرام کرتا ہوں اور آخری حصے میں اٹھ کر تہجد میں قیام اللیل میں اپنی مقررہ مقدار پوری کرتا ہوں، اور ایک جملہ فرمایا، بخاری شریف کی روایت ہے، **وأنا أحتسب نومتی کما أحتسب قومتی**، میں اپنی نیند میں، سونے میں بھی اللہ سے اسی طرح ثواب کی امید رکھتا ہوں جس طرح نماز کے لیے کھڑے ہونے وقت ثواب کی امید رکھتا ہوں۔ (بخاری شریف، کتاب المغازی، ۴۰۸۶)

ہم اور آپ اور ہر آدمی سمجھتا ہے کہ جب ہم نماز کی نیت باندھتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس عمل پر اللہ کی طرف سے ہمیں ثواب دیا جائے گا، لیکن جب کوئی آدمی سوتا ہے تو سوتے وقت بھی کبھی اسے خیال آتا ہے کہ اس سونے پر بھی اللہ تعالی کی طرف سے مجھے ثواب دیا جائے گا؟ یہی بات اگر پیدا ہو جائے اور اسی نیت سے سوئے گا تو اس پر بھی ثواب ملے گا۔ یہی حضرت معاذ ؓ نے فرمایا ہے۔

لیکن ہر جگہ وہ ایک چیز ضروری ہے:

احتساب۔ اللہ کا حکم پورا کرنے والی کیفیت۔

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جہاں دینا ہے اس جگہ اللہ کے لیے دیا تو یہ

ایک علامت ہے اس بات کی کہ اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا، جب ان چار چیزوں میں یہ بات پیدا ہوجائے گی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی اپنے آپ کو نکھار چکا ہے، اس نے اپنا معاملہ سب ٹھیک کرلیا ہے اور ایسے آدمی کا جو بھی کوئی کام ہوگا وہ اللہ ہی کے لیے ہوگا۔

میں عرض کررہا تھا کہ دینا اللہ کے لیے ہو، اور روکنا بھی اللہ کے لیے ہو۔ کسی کو کچھ دینے سے رکتا ہے تو اللہ کے لیے رکتا ہے۔

رسم ورواج میں نہ دینا، اللہ کے لیے ہے۔

بھائی! آپ کے خاندان میں شادی ہے، شادی کے موقع پر عام طور پر کچھ لیا دیا جاتا ہے، وہاں آپ کو بھی دعوت دی۔ آپ گئے، دیکھا کہ وہاں ٹیبل رکھا ہوا ہے، وہیوار (વહેવાર) اور چاندلا (ચાંદલા) دینے کے واسطے۔ یہ کوئی شرعی چیز ہے؟ ہرگز نہیں۔ فقط ایک رسم ورواج ہے۔ ایسا جو کچھ کیا جاتا ہے وہ رسم ورواج کے طور پر ہی ہوتا ہے، اللہ کا حکم بھی نہیں اور شریعت کی تعلیم بھی نہیں۔ یہاں جو کچھ دیا جائے گا وہ بجائے ثواب کے آدمی کے لیے اللہ تعالیٰ کی گرفت اور پکڑ کا ذریعہ بنے گا۔

ایک آدمی کے پاس بہت رقم ہے؛ لیکن یہاں نہیں دیتا، ساری دنیا کہتی ہے کہ دو، مگر وہ کہتا ہے کہ میں نہیں دوں گا، الحمد اللہ ایسے لوگ ہیں۔ ایسے مواقع میں دینا شریعت کے حکم کے مطابق نہیں اور شریعت نے اس طرح رسم ورواج کے طور پر دینے سے منع کیا ہے اس لیے نہیں دیتے۔

صلہ رحمی، رسم ورواج کے خانے میں۔

ہمارے یہاں عام طور پر اپنے رشتے داروں کے ساتھ جتنے بھی معاملے کیے جاتے ہیں وہ اسی رسم ورواج میں کھو جاتے ہیں۔ حالاں کہ صلہ رحمی کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ رشتے داروں کے حقوق کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور اس پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے؛ لیکن ہم نے اپنے آپ کو رسم ورواج کا پابند بنا کر ان ساری بھلائیوں کو اسی خانے میں ڈال دیا۔ اللہ کے لیے کیے جانے والے اعمال رسم و رواج کے تابع کر دیے۔

بھائی کے یہاں شادی یا اور کوئی موقع ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ اب تو دینا ہی پڑے گا۔ ویسے عام حالات میں آدمی دینے کا کبھی ارادہ کرتا ہے تو عورتیں کہتی ہیں کہ اس کے یہاں بیٹی کی شادی آنے والی ہے، اس موقع پر دینا۔ چوں کہ اس وقت نام ہو گا۔ کاپی میں لکھا جائے گا کہ اس نے اتنا دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ رسم ورواج کی پابندی ہے، یہ اللہ کا حکم پورا نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایسے وقت نہ دینا، یہ اللہ کے واسطے نہ دینا کہا جائے گا۔

چراغ کے تیل میں اسراف

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور اس نے اپنی حاجت حضور اکرم ﷺ کے سامنے بیان کی، تا کہ آپ ﷺ اسے پوری فرما دیں۔

حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ کے پاس اگر دینے کے لیے ہوتا تو آپ خود عنایت فرمایا دیا کرتے تھے یا آئندہ کے لیے کوئی وعدہ فرما دیا کرتے، یا اپنے صحابہ میں سے کسی کے پاس بھیجتے تھے کہ جاؤ، فلانے کے پاس چلے جاؤ، وہ تمہاری ضرورت پوری کریں گے۔

اس شخص نے آکر اپنی ضرورت پیش کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ، عثمان کے پاس چلے جاؤ۔

سیدنا عثمانؓ بڑے مالدار تھے، ہمارے یہاں تو آپؓ عثمان غنی ہی سے مشہور ہیں۔ رات کا وقت تھا، یہ آدمی حضور اکرم ﷺ کی ہدایت کے مطابق حضرت عثمانؓ کے گھر پہنچا، ان کے دروازے کے قریب جب گیا تو اس کے کان میں کچھ آواز پڑی کہ اندر حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ محترمہ کو کچھ کہہ رہے ہیں اور ڈانٹ رہے ہیں۔ یہ کھڑا ہو گیا، معلوم ہوا کہ انہوں نے چراغ کی بتی جس کو ہم گجراتی میں دیویٹ (દીવેટ) کہتے ہیں وہ ذرا اونچی رکھی تھی، اونچی رکھنے سے چوں کہ تیل زیادہ جلے گا، اس لیے وہ اپنی اہلیہ کو تنبیہ فرما رہے تھے کہ چراغ کی بتی اونچی کیوں رکھی؟ یہ فضول خرچی ہے، اسراف ہے۔ اس سے تیل زیادہ جلے گا۔ اس آدمی کے کان میں جب یہ آواز پڑی تو اس نے سوچا کہ جو آدمی اپنی بیوی کو چراغ کی بتی ذرا تیز رکھنے پر ڈانٹ دے، اور بیوی بھی کون؟ نبی کریم ﷺ کی صاحب زادی! وہ بھلا میری حاجت کیا پوری کرے گا؟ اس نے اپنے طور پر یہ سوچا اور وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ نہ اپنی بات پیش کی نہ کچھ عرض کیا۔

دوسرے دن جب وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو حضور اکرم ﷺ

نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تمہاری حاجت پوری ہوئی؟ حضور ﷺ نے پوچھا اس لیے انہوں نے بتلایا کہ میں نے جب ان کی یہ بات سنی تو ان کے سامنے بات رکھی ہی نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور اپنی بات پیش کرو۔

جب دوبارہ تاکید فرمائی تو وہ شخص گیا اور بات رکھی تو جو ضرورت تھی اس سے زیادہ دیا، جو امید تھی اس سے بھی زیادہ ملا۔ پھر اس نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ میں تو کل رات آیا تھا اور ایسا قصہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ تم نے سمجھا ہی نہیں، جہاں ہم کو خرچ کرنے سے منع کیا گیا وہاں ایک پائی بھی خرچ نہیں کریں گے اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں سب کچھ لٹا دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہم تو حضور اکرم ﷺ کی منشا اور آپ کی مرضی دیکھتے ہیں کہ آپ نے کہاں خرچ کرنے کے لیے فرمایا ہے۔

آدمی اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے؛ لیکن ضرورت سے زیادہ ہے تو شریعت نے اسی کو اسراف اور فضول خرچی سے تعبیر کیا اور منع فرمایا، جائز نہیں۔ آج ہمارا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ جہاں خرچ کرنے سے منع کیا گیا وہاں خرچ کر رہے ہیں، جہاں حکم دیا گیا وہاں ہم خرچ کرنے کو تیار نہیں۔ یہی تو فرق ہے ہمارے اور حضرات صحابہؓ کے درمیان۔

قصۂ اُفک۔

بخاری شریف میں روایت ہے۔ (مغازی، باب حدیث الافک، ۳۹۱۰)

نبی کریم کے زمانہ میں ایک مرتبہ ایک غزوہ سے لوٹتے ہوئے حضرت عائشہؓ کا ہار

ٹوٹ گیا تھا اور وہ اس کی تلاش وجستجو میں رہیں اس لیے قافلہ سے بچھڑ گئیں۔ ایک صحابی جو سب سے پیچھے رہا کرتے تھے انہوں نے ان کو دیکھا اور اپنے اونٹ پر سوار کر کے قافلہ میں لائے۔ اس موقع پر بعض منافقین نے حضرت عائشہؓ کے متعلق تہمت گھڑ لی اور مدینہ منورہ میں ان کے خلاف باتیں چلا دیں۔ قصہ تو بڑا طویل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس تہمت کی وجہ سے بڑی پریشانی رہی اور ایک مہینہ تک یہ سلسلہ رہا۔ لیکن بات تحقیقی نہیں تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس انتظار میں تھے کہ وحی آئے اور کچھ پتہ چلے؛ مگر وحی میں بھی تاخیر ہوگئی۔

اس تہمت والے قصے میں زیادہ تر حصہ تو منافقین کا تھا؛ لیکن بعض مخلص مؤمنین بھی اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ان منافقین کے داو میں آکر اس چرچے میں شامل ہو گئے اور اس تہمت والے واقعہ میں حصہ لیا۔ انہی میں ایک صحابی تھے حضرت مسطح بن اُثاثہ رضی اللہ عنہ۔ ان کی والدہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ یہ غریب تھے، مہاجرین میں سے تھے اور حضرت ابوبکرؓ ان کی رشتہ داری اور غربت کی وجہ سےؓ ان پر خرچ کرتے تھے اور ان کا نفقہ بھی دیتے تھے۔ گویا حضرت ابوبکرؓ نے ان کا وظیفہ باندھ رکھا تھا۔

ایک مہینہ کے بعد قرآن پاک میں حضرت عائشہؓ کی کی براءت میں آیتیں نازل ہوئیں اور سورہ نور میں اور اللہ تعالی نے صاف صاف بتلا دیا کہ یہ سب باتیں تہمت ہیں، جھوٹی ہیں اور بہتان ہیں۔ اب جب کہ قرآن کی آیتوں سے یہ بات طے ہو چکی کہ یہ سارا واقعہ تہمت تھا تو جو لوگ اس میں ملوث تھے ان پر حد جاری کی گئی اور تہمت والی سزا دی گئی۔

اب تک چوں کہ واقعہ کی تحقیق نہیں ہوئی تھی اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھااور جونفقہ اورخرچہ دیتے تھے وہ جاری تھا۔

ہم اورآپ ہوتے تو پہلے دن سے معاملہ ختم ہوجاتا۔ میرے پیسوں سے پل رہے ہیں میرادانہ کھارہے ہیں اورہماری لڑکی کے بارے میں یہ باتیں؟ میری بلی مجھ سے میاؤں! لیکن نہیں، جب تک کہ واقعے کے متعلق حقائق سامنے نہیں آئے تھے،کوئی فیصلہ حضرت ابوبکرصدیقؓ نے نہیں کیا۔

نہ دینے کی قسم کے بعددینے کی قسم۔

جب آیتیں نازل ہوئیں اوریہ طے ہوچکا کہ یہ واقعہ غلط ہےاورملوث ہونے والوں کاہی قصورتھا،توچوں کہ عائشہؓ جہاں حضرت ابوبکرصدیقؓ کی صاحب زادی تھیں وہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ مطہرہ بھی تھیں،یعنی حضرت ابوبکرکے ساتھ بیٹی ہونے کاتعلق تھاوہیں حضوراکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زوجیت کاتعلق تھا،اسی بنیادپرکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ مطہرہ کے ساتھ انہوں نے ایسا سلوک کیا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کا نفقہ بندکردیااورجوخرچ دیاکرتے تھےوہ روک دیا۔ یہ بندکرنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق کی نسبت پرہی تھا؛مگرچوں کہ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ مخلصین مؤمنین میں سے تھے اورمنافقین کی چال میں پھنس کرغلطی سے گناہ کے مرتکب ہوئے تھے اس لیے اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے قرآن پاک میں ان کے بارے میں سفارش کی گئی۔اورسورہ نورمیں ایک آیت یہ بھی نازل ہوئی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى

وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِوَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور : ۲۲)

اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مقام بھی معلوم ہوتا ہے، قرآن نے ان کو اولوالفضل کہا ہے، فضیلت والا۔ اللہ تعالی کی طرف سے ان کو یہ سرٹیفکٹ دیا گیا۔ اندازہ لگائیے کتنا اونچا مقام تھا حضرت ابوبکرؓ کا۔

تم میں سے جو فضلیت والے ہیں اور مالی وسعت والے ہیں وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتے داروں پر اور مسکینوں پر اور اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہیں کریں گے۔

حضرت مسطحؓ میں یہ تینوں باتیں موجود تھیں، حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار بھی تھے، مسکین بھی تھے اور مہاجرین میں سے بھی تھے۔ اللہ تعالی نے یہ تینوں وصف بتلائے۔ اور فرمایا کہ ان پر خرچ نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں۔ معاف کردیں اور درگذر کریں۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالی تمہاری مغفرت کردے، اللہ تعالی تو مغفرت کرنے والا مہربان ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بلایا اور بلا کر کے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ حضرت ابوبکرؓ آیت سنتے ہی فورا کہنے لگے والله إني لأحب أن يغفر الله لي۔ اللہ کی قسم میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالی میرے گناہ معاف کریں اور اسی وقت حضرت مسطحؓ کا بند کیا ہوا نفقہ جاری کر دیا؛ بلکہ آئندہ کے لیے قسم کھائی کہ کبھی بند نہ کروں گا۔ اور بعض روایتوں میں ہے

کہ اب تک جو بند کیا تھا وہ بھی دیا اور آئندہ کے لیے دوگنا کر دیا۔ جب اللہ کا حکم آ گیا اور اللہ کی مرضی جب پالی تو فوراً دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم جب اپنی نفسانیت کی وجہ سے کوئی بات طے کر لیتے ہیں تو پھر کوئی قرآن وحدیث کی سینکڑوں دلیلیں بھی لا کر دے، ہم ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ مولانا صاحب! آیت اپنی جگہ پر درست ہے، حدیث بھی برابر ہے؛ لیکن وہ آدمی اس لائق ہے ہی نہیں کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی ضد کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ حضرات صحابہؓ کی شان یہ تھی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔ بہر حال روکنا بھی اللہ کے لیے تھا اور دینا بھی اللہ کے لیے شروع کر دیا۔

اصل یہی ہے کہ ہم اپنے مال کے متعلق فیصلہ کر لیں کہ ہم جو خرچ کریں گے وہ اللہ کے حکم کے مطابق کریں گے، جہاں اس کی طرف سے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کریں گے۔ نہیں کریں اور روک لیں گے تو مال چاہے کتنا زیادہ ہو، رسم و رواج کے طور پر ہم ایک پائی بھی دینے کے لیے راضی نہ ہوں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ دینا اور نہ دینا ہمارے لیے وبال بن جائے گا۔

رسم ورواج کی پابندی اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے

جو آدمی رسم کی پیروی میں خرچ کرتا ہے وہ بہت بڑا گناہ کرتا ہے، وہ رواج

کو اور غیر شرعی چیز کو بڑھاوا دے رہا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، **أبغض الناس إلى الله ثلاثة** لوگوں میں سب سے زیادہ مبغوض اللہ کی نگاہ میں تین آدمی ہیں۔ **ملحد في العرب**، ایک تو وہ آدمی جو حرم میں رہتے ہوئے بے دینی کا ارتکاب کرے، دوسرا ہے: **مبتغ في الاسلام سنة الجاهلية** ۔ مسلمان ہوتے ہوئے جاہلیت کے طور وطریق کو اختیار کرنے والا اور رسموں اور غیر اسلامی چیزوں کو اختیار کرنے والا۔ تیسرا ہے: **مطلب دم امرئ بغير حق ليهريق دمه** ۔ کسی آدمی کو مروانے کے لیے ناحق اس کی جان لینے کا خواہشمند۔ (بخاری، کتاب الدیۃ، باب طلب دم امرئ بغیر حق، ۶۴۸۸)

اس لیے ضرورت ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو پلے باندھتے ہوئے اپنے خرچ کرنے، دینے اور روکنے کے معاملہ میں بھی ان ہی اصولوں کو مد نظر رکھیں۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

زمانہ کو اسلام کے عملی نمونہ کی تلاش ہے

دنیا تو نمونہ چاہتی ہے، آج ہم جو نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کو دیکھ کر دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے یہی اخلاق اسلامی اخلاق ہیں، ہماری یہی معاشرت اسلامی معاشرت ہے، ہمارے یہی معاملات اسلامی معاملات ہیں اور ان سب کو دیکھ کر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایسی ہی خراب تعلیم دیتا ہے۔ گویا ہم لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔ آج لوگ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہیں اور ہم اسلام کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنے معاملات و اخلاق کے ذریعہ اور اپنی معاشرت بتا کر ان کو روک رہے ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ یہ اسلامی اخلاق ہیں؟ اگر اسی کا نام اسلامی اخلاق ہے تو کون اس کو قبول کرے گا؟

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

چوک بازار میمن ہال، ۱۰، دسمبر ۱۹۹۳ء۔

الحمدلله نحمده و نستعينه و نستغفره و نؤمن به و نتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور أنفسنا و من سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له و من يضلله فلا هادى له و نشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريک له و نشهدأن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله، أرسله إلى كافة الناس بشيرا و نذيرا۔

أما بعد۔

فأعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم۔

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدة:۳)

و قال تعالیٰ: وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُواْ وَاصْفَحُواْ حَتَّى يَأْتِيَ اللهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرة: ۱۰۹)

تکمیلِ دین کی تقریب

محترم حضرات! یہ آیتِ کریمہ جو اس وقت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، یہ پوری آیت بھی نہیں بلکہ آیت کا ٹکڑا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حجۃ الوداع میں تشریف لے گئے اور میدانِ عرفات میں یومِ عرفہ کو جب آپ جبلِ رحمت کے قریب وقوف فرما تھے اس وقت یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ بعض یہود نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ قرآن پاک میں ایک ایسی آیت ہے کہ اگر وہ ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے نازل ہونے کے دن عید مناتے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ وہ کون سی آیت ہے؟ انہوں نے بتلایا کہ وہ یہ آیت ہے:

الیوم أکملت لکم دینکم و أتمت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا

تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ کس دن، کس جگہ پر نازل ہوئی تھی، اور اس وقت نبی کریم ﷺ کس حالت میں تھے وہ سب کچھ یعنی اس کے نزول کا پورا منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ یومِ عرفہ کو نازل ہوئی تھی اور وہ جمعہ کا دن بھی تھا۔ (بخاری، کتاب الایمان: ۴۴)

علماء نے لکھا ہے کہ سال کے تمام دنوں میں افضل ترین دن یومِ عرفہ ہے اور ہفتہ کے دنوں میں افضل ترین دن جمعہ کا دن ہے۔ تو اس روز یومِ عرفہ بھی تھا اور یومِ جمعہ بھی تھا۔ گویا حضرت عمرؓ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ ہمیں اس آیت کے نزول کے دن کو تقریب کے طور پر اپنی طرف سے منانے اور متعین کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس آیت کو نازل ہی فرمایا ہے ایسے دن میں کہ وہ دن ہمارے لئے پہلے ہی سے تقریب اور عید کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا، اپنی نعمت اور اپنا احسان تم پر پورا کر دیا اور تمہارے لئے دینِ اسلام کے دین ہونے پر میں راضی ہو گیا۔“

کرشمہ دامن دل می کشد

نبی کریم ﷺ پر جو دین بذریعۂ وحی نازل کیا جارہا تھا، اس آیت کے ذریعہ اس کے مکمل کئے جانے کی خوش خبری دی گئی ہے۔ حضورا کرم ﷺ جس دین کو لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے اور آپ نے اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے جو پیغام اللہ کی مخلوق اور انسانوں تک پہنچایا ہے اور جس شریعت کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا تھا؛ اس میں انسانوں کے لیے ہر طرح کی ہدایت موجود ہے۔

شریعتِ اسلامیہ خوبیوں اور محاسن کا مجموعہ ہے۔ اس کی ہر چیز خوبی اور کمال کی حیثیت رکھتی ہے۔

از فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم۔ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است۔

سر سے لے کر پیر تک جہاں بھی نظر پڑتی ہے اور دیکھتا ہوں، وہاں اس کا کمال نگاہ ودل کو دعوت دیتا ہے کہ دیکھنے کی جگہ یہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی ہر چیز کامل ہی کامل ہے اور خوبی ہی خوبی ہے۔

پہلی خوبی: جامعیتِ ہدایت۔

دینِ اسلام اور شریعتِ مطہرہ کی ان تمام خوبیوں میں سے ایک خوبی اس کی جامعیت ہے۔ یہ ایسی جامع شریعت ہے کہ اس میں ہدایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ جامعیتِ ہدایت لئے ہوئے ہے۔ یعنی اس شریعت میں انسان کے لئے تمام شعبہائے حیات کے بارے میں ہدایتیں دی گئی ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام میں کوئی ہدایت موجود نہ ہو۔ اسلام کے علاوہ

دیگر مذاہب کے احوال اور اس کے نقائص سے اگر آپ واقف ہوں تو معلوم ہوگا کہ ان مذاہب میں انسانی زندگی کے بہت سارے شعبے تشنۂ تکمیل ہیں اور ان کے متعلق ان مذاہب میں ہدایت موجود نہیں۔

چنانچہ ہندو مذہب ہی کو لے لیجیے۔ معاشرت کے متعلق کوئی حکم اور کوئی تفصیل اس مذہب میں موجود نہیں ہے۔ اسی لئے ان لوگوں کو معاشرت کے شعبے سے تعلق رکھنے والے احکام کی تکمیل پارلمینٹ اور دوسرے ذرائع سے کرنی پڑتی ہے۔ یہ لوگ پارلمینٹ میں قانون پاس کر کے اپنے ان معاشرتی پہلوؤں کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی آپ دیکھیں اور ان کا مطالعہ کریں تو زندگی کے سارے شعبوں کو ان مذاہب میں گھیرا نہیں گیا ہے، ان کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ انسانی زندگی کے تمام شعبے اس میں آ گئے ہیں۔ چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت ہو۔ چاہے دنیا ہو یا آخرت ہو۔ قیادت ہو یا سیاست ہو۔ چاہے تمدن ہو یا معاشرت ہو۔ عبادت ہو یا عادت ہو۔

بلکہ انسان کے سارے حالات کے متعلق مذہب اسلام میں ہدایات موجود ہیں۔ انسان کے اوپر جو مختلف احوال آتے ہیں؛ مثلاً تندرستی ہو یا بیماری ہو۔ سفر کی حالت ہو یا حالتِ اقامت ہو۔ چاہے امیر ہو یا غریب ہو۔ غمی کی حالت ہو یا خوشی کی حالت ہو۔ موت ہو یا زندگی ہو۔ سونے کے متعلق ہو یا بیداری سے متعلق ہو؛ کوئی حالت اور کوئی کیفیت ایسی نہیں جس کے متعلق ہدایتیں موجود نہ ہو۔ ہر چیز کی تفصیل کے ساتھ اسلام نے ہدایات بیان فرمائی ہیں۔ گویا ایک ایسا جامع مذہب

ہے کہ اس نے انسانی زندگی کے کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ کسی گوشے کے متعلق یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ اس کے متعلق اسلام میں کوئی ہدایت اور رہ نمائی موجود نہیں۔

تو ایک خوبی تو یہ ہوئی کہ 'جامعیتِ ہدایت' اسلام میں موجود ہے۔

دوسری خوبی: جامعیت احکام۔

جامعیت ہدایت کے ساتھ دوسری خوبی 'جامعیت احکام' کی ہے۔ زندگی کے شعبوں سے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں ہر ہر حکم اپنی جگہ پر جامع ہے۔ اس میں کسی طرح کی ترمیم و اضافہ اور تصحیح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی بھی ایک چیز کے متعلق اسلام کا پورا حکم اگر آپ دیکھیں اور اس کا شروع سے لے کر آخر تک کا آپ مطالعہ کریں تو اس میں اعتدال آپ کو نظر آئے گا۔ نہ اس میں افراط ہے نہ تفریط ہے۔ کسی ایک پہلو کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔ یہ میانہ روی ایک ایسی خوبی ہے جو ہر چیز کو باقی رکھنے والی ہے۔ جس میں اعتدال ہوتا ہے وہ چیز باقی رہتی ہے۔ افراط اور تفریط والی بات باقی نہیں رہتی۔ تو گویا اسلام کے تمام احکام جامع بھی ہیں۔

پھر اس کے نتائج اور ثمرات کو دیکھا جائے، اس کے فوائد شمار کئے جائیں تو بھی اسلام کا حکم جامع ہے۔ یعنی جو حکم دیا گیا ہے وہ دنیوی اعتبار سے مفید ہے اور اُخروی اعتبار سے بھی اس میں فائدہ موجود ہے۔ روحانی اعتبار سے آپ دیکھیں تو فائدہ مند ہے اور مادّی اعتبار سے بھی وہ نفع بخش ہے۔

اسلام کے احکام میں فقط آخرت مدِ نظر نہیں ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ

مذہب کا تعلق صرف آخرت سے ہے، وہ آخرت کے امور سے بحث کرتا ہے۔ دنیا سے اس کا تعلق نہیں ہے؛ لیکن اسلام صرف آخرت کے امور سے بحث نہیں کرتا، انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام حالات سے بحث کرتا ہے۔ اسلام کی رہنمائی کے جو فوائد اور ثمرات ہیں وہ صرف اخروی زندگی تک محدود نہیں، دنیوی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہیں۔

وضو اور نماز کے فوائد۔

نماز ہی کو لے لیجیے۔ نماز کا فائدہ صرف اُخروی اعتبار سے نہیں، دنیوی اعتبار سے بھی نماز کے اندر بڑے فائدے ہیں۔ اس پر لوگوں نے مستقل تصنیفات لکھی ہیں۔ مثلاً پنج وقتہ نمازیں اللہ تعالی کی طرف سے مقرر کی گئی ہیں: إن الصلوة كانت علىٰ المؤمنين كتاباً موقوتاً، نماز مسلمانوں پر مقررہ وقت پر فرض ہے۔ اس پنج وقتہ نماز کی پابندی سے آدمی کی زندگی میں ایک نظام الاوقات اور ٹائم ٹیبل قائم ہوجاتا ہے اور دن بھر کے تمام کاموں میں ترتیب و نظام کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے۔

نماز کی ہر چیز میں فائدہ ہے۔ وضو کیجیے تو اس میں تندرستی کے اعتبار سے بڑے فوائد ہیں۔

نماز جب جماعت کے ساتھ ادا کی جائے گی تو لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں ہوں گی اور مراسم پختہ ہوں گے۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی اور عیادت، تیمارداری اور خبر گیری ہوگی۔ ایک دوسرے کے حالات پر واقفیت ہوگی۔ اجتماعیت کے لئے جو

چیزیں ضروری ہیں وہ تمام جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی صورت میں حاصل ہوگی۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جماعت کی صفوں میں جو ترتیب ہوتی ہے اس میں بھی بہت بڑے فائدے ہیں۔ ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: صفوں کو درست کیجیے، اللہ تعالی تمہارے دلوں کے اندر اتفاق واتحاد پیدا کرے گا۔ کتنا بڑا فائدہ ہے۔

آج کل اتحاد و اتفاق کے لئے کتنی کوششیں کی جاتی ہیں، اس کے لئے بڑی رقمیں خرچ کی جاتی ہیں۔ اس کے لئے مستقل ادارے، انجمنیں اور سوسائیٹیاں قائم کی گئی ہیں؛ لیکن جماعت کی نماز میں صفوں کی ترتیب کا لحاظ کرنا یہ چیز آپ ہی آپ قلوب کے اندر جوڑ پیدا کرنے والی اور انسانی دلوں کو ملانے والی ہے۔

روزہ کے دینی ودنیوی فوائد۔

شریعت کا کوئی بھی حکم لے لیجیے۔ اس میں آپ کو فوائد ہی نظر آئیں گے۔ روزہ میں غور فرمائیں! اس کا اُخروی فائدہ اپنی جگہ پر ہے۔ دنیوی اعتبار سے صحت ٹھیک ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد موجود ہے: صوموا تصحوا روزہ رکھو، تمہاری صحت ٹھیک ہوگی۔

زکوۃ کی ادائیگی میں معاشرتی واقتصادی مساوات۔

زکوٰۃ کی ادائیگی کے نتیجے میں معاشرے کے اندر اونچ نیچ کی جو تفریق ہے

اس میں بڑا اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ اغنیاء اور مالدار اپنی زکوٰۃ ادا کریں گے اور فقراء کے احوال کی خبیر گیری کریں گے تو سماج کے طبقات کے میں آپس میں جو منافرت اور درجہ بندی پیدا ہوجاتی ہے وہ ختم ہوجائے گی۔ جس طبقاتی نظام کی وجہ سے کمیونیزم پیدا ہوا تھا اس کی یہاں نوبت ہی نہیں آتی۔

بہر حال! اسلام کے جتنے بھی احکام ہیں اس کا فائدہ آخرت ہی کے لئے خاص نہیں، اُخروی اور دنیوی دونوں فائدے موجود ہیں۔ اس میں روحانی فائدہ بھی ہے اور مادّی بھی ہے۔ چنانچہ اسلام کی یہ ساری ہدایتیں جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ وہ اتنی جامع ہیں کہ اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے فوائد کا بھی احصاء کرلیا گیا ہے۔

اسلام کی جامعیت، کج فہموں کے اعتراض کا سبب

خلاصہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالی نے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ جو شریعت ہمیں عطا فرمائی وہ بڑی جامع شریعت ہے۔ بلکہ بعض کج فہم لوگوں کے لیے یہ جامعیت ہی اعتراض کا سبب بن گئی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، ابن ماجہ میں حضرت سلمان فارسی ؓ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے مجھ سے سوال کیا: **إنی أری صاحبکم یعلمکم کل شیئ حتیٰ الخراءۃ؟** کہ تمہارے نبی تم کو ہر چیز سکھلاتے ہیں، یہاں تک کے کہ استنجاء کس طرح کیا جائے وہ بھی تم کو بتاتے ہیں؟ سوال کرنے والے نے یہ سوال استہزاء کے طور پر کیا تھا کہ تمہارے نبی تو عجیب ہیں کہ تم کو استنجاء کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟

حالانکہ یہ تو کمال کی چیز تھی کہ اسلام نے انسان کو ہر ہر چیز بتلائی ہے یہاں تک کہ استنجاء کس طرح کیا جائے، وہ بھی بتلایا۔ دنیا میں کوئی اور مذہب آپ ایسا بتا سکتے ہیں جس میں استنجاء کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہو؟ یہ اسلام کی جامعیت نہیں تو اور کیا ہے؟ چنانچہ حضرت سلمان فارسیؓ نے سائل کے اس سوال پر چراغ پا ہونے اور غصہ ہونے کے بجائے جواب میں فرمایا۔ **نعم**، جی ہاں! ہمارے نبی ہم کو ہر چیز بتاتے ہیں یہاں تک کہ استنجاء کا طریقہ بھی بتایا۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ ہدایت دی گئی کہ جب ہم استنجاء کے لئے بیٹھے تو قبلہ رُخ نہ بیٹھیں، داہنا ہاتھ استعمال نہ کریں۔ تین ڈھیلوں سے کم پر اکتفاء نہ کریں اور یہ بھی بتایا کہ ہم لید اور ہڈیوں کو استعمال نہ کریں۔ جو جو ہدایتیں نبی کریم ﷺ نے استنجاء کے سلسلے میں ارشاد فرمائی تھیں وہ تمام ہدایتیں حضرت سلمان فارسیؓ نے اس اعتراض کرنے والے کے سامنے پیش کیں۔ (ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب الاستنجاء: ۳۱۶)

آداب استنجاء کی حکمتیں

اور ان ہدایتوں میں آپ غور کریں تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام نے استنجاء جیسی ایک جزوی چیز کے اندر تمام حقوق کی رعایت کی ہے۔ دیکھئے! قبلہ اور کعبہ شعائر اللہ میں سے ہے اور اس کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ استنجاء کے وقت کعبہ کی طرف رُخ کرنے سے منع کیا گیا اس میں حقوق اللہ کی رعایت کی گئی کہ کعبہ شعائر اللہ میں سے ہونے کی وجہ سے قابلِ تعظیم ہے، اس لئے ایسا نہ کریں کہ استنجاء کی حالت میں اُدھر رُخ کریں۔ یہ اللہ کے حق کی رعایت ہوئی۔

اس کے بعد جب یہ کہا گیا کہ دائیں ہاتھ کو استعمال نہ کریں، اس میں حق النفس کی رعایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کے بعض اعضاء کو ایک خصوصی شرف عطا فرمایا ہے، داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر شرف بخشا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ کوئی چیز لینی ہو یا دینی ہو تو دائیں ہاتھ سے دی اور لی جاتی ہے۔ یہی ادب کا تقاضہ ہے اور یہی شرافت کی بات ہے اور کوئی کمتر کام کرنا ہو مثلاً ناک صاف کرنا ہے تو اس کے لئے بایاں ہاتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو استنجاء میں دائیں ہاتھ کو استعمال نہ کرنے کی ہدایت دینے میں شریف آدمی کی رعایت کی گئی۔ یہ حق النفس یعنی آدمی کی ذات کے حق کی رعایت کی گئی۔

اور پھر ساتھ ساتھ یہ کہا گیا کہ تین ڈھیلوں سے کم پر اکتفا نہ کیا جائے۔ اس لئے کہ تین سے کم ڈھیلے استعمال کریں گے تو اس میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ پورے طور پر استنجاء نہیں ہو پائے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کی روح کو اذیت پہنچے گی، تو آدمی کی روح کے حق کی بھی رعایت کی گئی ہے۔

اور ساتھ ساتھ یہ حکم دیا گیا کہ لید اور ہڈی کو استعمال نہ کیا جائے، حدیث پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہڈیاں جنات کی خوراک ہے اور لید اس کے جانوروں کی خوراک ہے۔ (مسلم، کتاب الصلاۃ، ۴۵۰) شریعت نے ان دونوں کو استعمال کر کے خراب کرنے سے منع کیا۔ گویا دیگر مخلوق کے حقوق کی بھی رعایت کی گئی۔ جس مذہب میں استنجاء کے لئے دیئے جانے والے احکام میں حق اللہ، حق النفس، روح کے حق کی اور دیگر مخلوقات کے حقوق کی رعایت کی جاتی ہو تو دوسرے احکام میں کتنا کمال اور کتنی خوبیاں ہوں گی، آپ اس کا اندازہ

لگا سکتے ہیں۔

بہر حال ! نبی کریم ﷺ جس شریعت کو لے کر کے آئے وہ بڑی جامع شریعت ہے۔ اور میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے جو شریعت ہمیں عطا فرمائی ہے وہ زندگی کے صرف ایک شعبے تک محدود نہیں ہے۔

دین کے مختلف شعبے

اس لئے علماء نے دین کے پانچ حصے کر دیئے ہیں۔ ایک حصہ عقائد سے تعلق رکھنے والا ہے کہ آدمی اپنے عقیدے کو درست کرے۔ اللہ کے متعلق کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟ نبیوں کے متعلق کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟ نبی آخر الزماں نبی کریم ﷺ کے متعلق کیا عقیدہ ہونا چاہیے؟ فرشتوں کے متعلق، نبیوں پر اترنے والی کتابوں کے متعلق، قیامت کے دن کے متعلق اور جنت و دوزخ کے متعلق کیا عقائد ہونے چاہیے؟ مطلب یہ کہ ایک پورا باب اور شعبہ عقائد کا ہے۔

دوسرا حصہ عبادات سے تعلق رکھتا ہے۔

تیسرا حصہ معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

چوتھا حصہ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے۔

اور پانچواں معاشرت سے تعلق رکھتا ہے۔

معاشرت کا تعلق آپس میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے سے ہے۔ ماں باپ کے حقوق، میاں بیوی کے حقوق، اولاد کے حقوق، دوستوں کے حقوق، بھائیوں کے حقوق، اللہ کی مخلوقات کے حقوق اور حقوق سے متعلق دوسرے جتنے بھی

احکامات ہیں وہ سب معاشرت کے اندر آجاتے ہیں۔ شریعتِ اسلامیہ نے جو احکامات دیئے ہیں وہ ان پانچ حصوں پر منقسم کیے گئے ہیں۔

آج کل ہمارا حال کیا ہوگیا ہے؟ میں جو چیز پیش کرنا چاہتا تھا وہ اب عرض کرتا ہوں۔ اب تک جو پیش کیا وہ تمہید کے طور پر تھا کہ نبی کریم ﷺ ایک جامع شریعت لے کر کے آئے تھے، جس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق رہنمائی کی گئی تھی۔

کیا یہ رہنمائی اس لئے دی گئی کہ ہم ان میں سے کسی شعبے کو اپنی عملی زندگی میں نہ اتاریں؟

عقائد کی درستگی کی ضرورت

جب تک کہ آدمی کا عقیدہ درست نہ ہو وہاں تک وہ مؤمن نہیں ہوسکتا۔ عقیدے پر تو ایمان موقوف ہے۔ عقائد سے متعلق حال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اس کی معمولی سی جانکاری ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالی کو ایک مانتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ کا رسول اور آخری پیغمبر مانتے ہیں۔ قیامت کے آنے کو برحق سمجھتے ہیں۔ فرشتوں کے متعلق ایمان ہے۔ بچپن میں یہ سب پڑھایا جاتا ہے اس لئے یہ چیزیں ذہنوں میں ہیں؛ مگر اس کے بعد تفصیلی عقائد کے متعلق تو کچھ جانتے ہی نہیں۔ عقائد کا باب تو اتنا اہم ہے کہ اس میں ذرّہ برابر فرق آجائے تو آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے اور تمام کتب فتاوی میں موجود ہے کہ کون سی باتوں سے اور کون سے کاموں کے کرنے سے آدمی ایمان سے نکل جاتا

ہے، ان چیزوں کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے؛ تا کہ دانستہ، نادانستہ، کوئی کام اس سے ایسا سرزد نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ ایمان سے نکل جاتا ہو۔

آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ بولنے میں ایسے ایسے الفاظ وکلمات اپنی زبان سے نکالتے ہیں کہ اگر آپ ان کلمات کے متعلق کتابوں میں دیکھیں تو حکم لکھا ہے کہ ایسا کہنے کی وجہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے؛ لیکن اس اللہ کے بندے کو یہ معلوم نہیں کہ میں نے جو بات زبان سے نکالی اس کی وجہ سے ایمان جاتا رہا۔

اسی طرح ایسے کام اور افعال جن کے کرنے سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے ان کو جاننا بھی ضروری ہے۔ آج ہم میں سے بہت سے لوگ اپنی نادانی، جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بہت سے کام ایسے کر ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے ایمان نکل جاتا ہے اور ان کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ میں ایمان سے محروم ہو گیا اور یہ آدمی اسی حال میں دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ دین کا یہ پہلا شعبہ عقائد کا تھا۔

ہماری عبادات کا حال

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے۔

آج کل کوئی آدمی اپنے آپ کو دین دار سمجھتا ہو اور کہتا ہو کہ مجھے دین سے تعلق ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ دین کا عبادت کا جو شعبہ ہے اس شعبے کو تھوڑا بہت۔ پورا تو کوئی ادا نہیں کرتا- ادا کر لیتا ہے۔ عبادات کے اندر نماز ہے۔ زکوۃ ہے، روزے ہیں اور پھر حج۔ اس کے علاوہ جو واجب ہیں اور نوافل ہیں؛ مالی اور جانی اس سے اس کو کوئی سروکار نہیں۔ آج کل گویا دین دار ہونے کے لئے عبادات

والے شعبے کے اعمال کافی سمجھے جاتے ہیں اور آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں پانچ وقت کی نماز پڑھ لیتا ہوں، رمضان کے ایک ماہ کے روزے رکھ لیتا ہوں اور اگر صاحبِ نصاب ہے تو مجھ پر جو زکوٰۃ ہے اس کو ادا کر لیتا ہوں یا اگر استطاعت ہے اور حج فرض ہوا تو حج ادا کر لیا؛ اسی پر ہم نے سمجھ لیا کہ اب ہم پکے مسلمان ہیں اور اسلام کے جتنے بھی احکام ہیں ہم نے وہ سب ادا کر لئے، ہمارے اسلام میں کوئی کمی نہیں رہی؛ حالانکہ عبادات تو اسلام کے پانچ شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔

ان عبادات کے اندر ہمارا حال کیا ہے؟ اگر ہم نماز پڑھتے ہیں تو کس انداز سے پڑھتے ہیں؟ جماعت کا کتنا اہتمام کرتے ہیں؟ وقت پر کتنی نمازیں ادا کرتے ہیں اور نماز کے لئے جن فرائض، واجبات، متممات اور سنتوں کی رعایت ہونی چاہیے، کتنی کرتے ہیں؟ وہ ہم اپنے دل سے پوچھ سکتے ہیں۔ ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر سوچ سکتا ہے کہ میں ان تمام چیزوں کا کتنا اہتمام کرتا ہوں؟ اس کے لئے کتنی کوشش کرتا ہوں؟ یہ دوسرا شعبہ ہوا۔

محاسن اخلاق؛ دین کا مستقل شعبہ ہے۔

تیسرا شعبہ اخلاق کا ہے۔

دین میں مختلف اخلاق ومحاسن کی باقاعدہ تعلیم دی گئی ہے۔ تواضع، انکساری، رضا بر قضا، اختیار کرنے کی۔ اپنے آپ کو کبر، حسد، بغض وکینہ اور غیبت وغیرہ سے دور رکھنے اور بچنے کی۔ یہ ساری چیزیں بد اخلاقی سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ اس طرح اخلاق کا مستقل ایک شعبہ ہے۔ آج کل ہم یہ جانتے ہی نہیں کہ اخلاقیات

بھی دین کا ایک شعبہ ہے۔

معاملات کے احکام کا علم فرض ہے۔

اس کے بعد معاملات کا نمبر ہے۔

ہم کسی کے ساتھ خرید و فروخت کرتے ہیں، یا کسی کے پاس سے مکان کرایہ پر لیا یا کسی کو دیا، کسی کو مزدوری پر رکھا یا کسی کے یہاں مزدوری کی۔ یہ جتنی بھی چیزیں ہیں یہ سب معاملات سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان تمام کے متعلق تو ہم یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو دین کا کوئی شعبہ ہے ہی نہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی آداب و احکام کچھ ہے ہی نہیں۔ حالانکہ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اگر تجارت کرتا ہو تو تجارت سے متعلق سارے احکام اور تجارت میں جن جن چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے ان تمام مسئلوں سے واقفیت حاصل کرنا نمبر اول پر ضروری ہے۔ پہلے ان سے واقفیت حاصل کرو پھر تجارت کرو۔ اس سے پہلے تجارت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب کوئی آدمی تجارت کے لئے بازار میں داخل ہوتا تھا تو سب سے اوّل اس سے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ بیع وشراء کے متعلق جو مسائل ہیں وہ معلوم ہیں؟ اگر معلوم نہ ہوتے تو اس کو تجارت کے واسطے لائسنس نہیں ملتا تھا؛ بلکہ اس کو کہا جاتا تھا کہ پہلے یہ سب مسائل جاکر معلوم کرو۔ یہ بھی اسلام کی خوبی ہے۔ اور ایسی پیش بندی تمام شعبوں میں ضروری ہے۔ بچہ بالغ ہوتا ہے تو بالغ ہوتے ہی اس پر نماز، روزہ فرض ہو جاتا ہے، تو بالغ ہونے سے پہلے اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ نماز روزے سے متعلق مسائل معلوم کر لے۔

طہارت و پاکی کے مسائل جان لے۔

معاشرتی فرائض یعنی حقوق کی ادائیگی۔

ایک اور شعبہ ہے معاشرت کا۔

معاشرت یعنی ایک دوسرے کے حقوق۔ باپ کے اوپر بیٹے کے کیا حقوق ہیں؟ اس کی تربیت کس طرح ہونی چاہیے؟ بیٹے کے اوپر باپ اور ماں کے کیا حقوق ہیں؟ میاں بیوی کے حقوق، بھائی بہنوں کے حقوق، دوستوں کے اور رشتہ داروں کے حقوق۔ یہ ساری چیزیں معاشرت کے اندر آتی ہے۔ ان کو جاننا بھی نہایت ضروری ہے۔ معاشرت یعنی زندگی گذارنے کے اسلامی طریقے اور آدابِ زندگی سے واقفیت بھی دین کا ایک شعبہ ہے۔

کوئی آدمی نکاح کرنا چاہتا ہے تو نکاح سے متعلق احکام کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ بیوی کے حقوق وغیرہ۔ آج کل نکاح سے پہلے اس کی خوب تیاریاں ہوا کرتی ہیں، دُلہے کے کپڑے کیسے ہیں، لڑکی کے زیوات کیسے ہیں؟ جہیز کا سامان کیا ہے؟ دعوت کتنے آدمی کی کی جائے گی؟ بارات میں کون جائے گا؟ دعوت میں کیا کھلایا جائے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے اہتمام کئے جاتے ہیں؛ لیکن نہ دلہن کو نہ دلہے کو، کسی کو اس کا احساس نہیں کہ نکاح کی وجہ سے جو حقوق ایک دوسرے کے اوپر واجب ہوتے ہیں ان کو بھی معلوم کرنا چاہیے؛ حالانکہ اسلام تو اس کو ضروری قرار دیتا ہے اور اس کے بغیر نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ بے شمار مسائل اسلام کے وہ ہیں جو معاشرت سے متعلق ہیں؛ لیکن مسلمان اس سے کتنے واقف ہیں؟

دین کے تمام شعبوں پر عمل ضروری ہے۔

تو آج میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم مسلمان بننا چاہتے ہیں تو صرف عبادت والا پہلو انجام دینے سے ہم مکمل مسلمان نہیں بن سکتے۔ اسلام کے مکمل پانچ پہلو بتلائے گئے ہیں۔ ان تمام پر عمل ضروری ہے۔ اگر صرف عبادت والا پہلو ہی لئے بیٹھے ہیں تو ہم بیس فیصد اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ اور 20% کی وجہ سے آدمی مکمل مسلمان نہیں بن سکتا۔ اور ہم یوں چاہتے ہیں کہ لوگ ہم کو یوں کہیں کہ ہم پورے دین دار ہیں۔ ہماری دینداری میں کوئی کمی نہیں ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ جہاں ہم عبادتوں کا اہتمام کرتے ہیں، وہاں ہم اخلاق کا، معاملات کا اور معاشرت کا اہتمام بھی کریں۔ آج ہماری معاشرت اتنی بگڑ چکی ہے کہ اس کے بگاڑ کی وجہ سے لوگ اور دنیا والے، دیگر مذاہب والے اسلام سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی معاشرت کو اسلامی بنیادوں پر درست کریں اور یہ سمجھیں کہ معاشرت بھی دین کا ایک حصہ ہے۔ اگر اس کو درست کریں گے تو لوگوں کے سامنے زبانی دعوتِ اسلام پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہماری معاشرت ہی عملی دعوت ہوگی اور اس کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کریں گے۔

مسلمانوں کی حسن معاشرت کا اعلیٰ نمونہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور اسلام کی دعوت دینی شروع

فرمائی تو وحی کے نزول سے لے کر ہجرت تک تیرہ سال تک آپ ﷺ کا قیام مکہ معظّمہ میں رہا۔ اس کے بعد آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مدینہ منورہ جانے کے بعد بھی مکہ والوں نے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو ایذائیں پہنچانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی طرف سے اسلام کو مٹانے کی جو کوششیں کی جاتی تھیں وہ اپنی جگہ جاری تھیں؛ بلکہ ان میں اور ترقی ہوئی تھی اور اسی وجہ سے بہت ساری جنگیں ہوئیں۔

صلح حدیبیہ۔

اسی میں سن ہجری ٦ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ میں نے اپنے چند رفقاء وصحابہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھا، ہم لوگ مکّہ پہنچے اور بیت اللہ کا طواف کیا پھر صفا ومروہ کی سعی کی اور احرام کھولا۔ بعض نے سر منڈوایا اور بعض نے بال کتروائے۔ نبی کریم ﷺ نے صبح یہ خواب صحابہ کرام کے سامنے بیان کیا۔ چونکہ نبی کا خواب سچا ہوتا ہے اور صحابہ کرام، خصوصاً وہ صحابہ جو ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ پہنچے تھے ان کو بھی ایک زمانہ گذر چکا تھا، اس لیے ان کے دل میں بیت اللہ کی زیارت کا شوق جوش مارنے لگا اور سب نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب آپ نے خواب دیکھا ہے اور آپ کا خواب سچا ہی ہے، لہٰذا ہم کو جانا چاہیے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کی ایک جماعت کو لے کر ذی قعدہ کی پہلی تاریخ کو مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ ایک روایت کے مطابق

چودہ سو اور ایک روایت کے مطابق پندرہ سو صحابہ کا مجمع تھا۔ یہ سب حضرات عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ والوں کو معلوم ہوا کہ مسلمان آرہے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی روانہ ہونے سے پہلے ایک صحابی بسر بن سفیان کو جن کا تعلق قبیلہ خزاعہ سے تھا، اس غرض سے بھیج دیا تھا کہ تم مکہ والوں کے حالات کا پتہ چلا کر ہمیں بتاؤ کہ ان کے کیا عزائم ہیں، اس لیے وہ مکہ پہلے سے پہنچ گئے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں سے روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ سے جو مدینہ والوں کی میقات ہے، احرام باندھا۔ ساتھ میں ہدی کے جانور لئے اور آگے بڑھے۔

راستہ میں ایک مقام پر ان صحابی نے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ والوں کی خبر لانے کے واسطے بھیجا تھا، آکر کے اطلاع دی کہ مکہ والوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمان عمرے کے لئے مکہ آنے کے واسطے چلے ہیں، اور انہوں نے ایک بڑا لشکر بھی جمع کر لیا ہے۔ ساتھ ہی مکہ کے اطراف میں جتنے بھی قبائل ہیں ان تمام کے ساتھ انہوں نے معاہدہ کیا ہے اور یہ طے کیا ہے کہ کسی حالت میں آپ کو اور مسلمانوں کو مکہ میں گھسنے نہیں دیں گے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ مشورہ میں مختلف باتیں سامنے آئیں۔ آخر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو عمرہ کے ارادے سے چلے ہیں، ہم اپنے ارادوں اور نیتوں میں کوئی تبدیلی نہ کریں، ہم آگے بڑھیں گے۔ اور مکہ کی طرف چلتے رہیں گے، کوئی اگر ہمارا راستہ روکے گا اور رکاوٹ ڈالے گا تو ہم اس کا

مقابلہ کریں گے ورنہ ہم لڑنے کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ چنانچہ سب آگے بڑھے۔ جب مقامِ حدیبیہ پر پہنچے تو نبی کریم ﷺ جس اونٹنی پر سوار تھے وہ بیٹھ گئی۔ صحابہ نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ **خلعت القصواء خلعت القصواء** قصواء بیٹھ گئی، قصواء بیٹھ گئی۔ 'قصواء' آپ ﷺ کی اونٹنی کا نام تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو آگے چلانا چاہا لیکن وہ نہیں اُٹھی، بلکہ اس نے اپنا سر بھی زمین پر ڈال دیا۔

خراش بن امیہؓ کی سفارت

نبی کریم ﷺ نے اس وقت فرمایا کہ آج مکہ والے اگر کوئی ایسی شرط میرے سامنے پیش کریں جس میں بیت اللہ کی رعایت کی گئی ہو تو ایسی تمام شرطوں کے ساتھ میں ان کے ساتھ صلح کرنے کے واسطے تیار ہوں۔ یہ فرما کر آپ نے اونٹنی کو اُٹھایا، چنانچہ وہ اُٹھ گئی۔ اس کے بعد حدیبیہ ہی میں ایک مقام پر جا کر آپ نے قیام فرمایا اور آپ ﷺ نے وہاں سے ایک آدمی: خراش بن امیہ کو، جو قبیلہ خزاعہ کے ایک آدمی تھے، مکہ والوں کے پاس بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ مکہ والوں سے جا کر کہ یوں کہو کہ ہم لڑنے کے واسطے نہیں آئے، بلکہ ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں بیت اللہ کی زیارت کر لینے دو، عمرہ کے افعال ادا کر کے ہم واپس ہو جائیں گے۔ لیکن مکہ والوں نے تو طے کر لیا تھا کہ ہم کسی حال میں ان کو گھسنے نہیں دیں گے، وہ لوگ یوں سمجھتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو فقط بیت اللہ کی زیارت کے لئے بھی آنے دیا تو لوگوں میں یہ شہرت ہو جائے گی کہ مکہ والے دب

گئے۔

وہ جب حضور ﷺ کا پیغام لے کر وہاں ان کے پاس پہنچے تو ان لوگوں نے ان کے اونٹ کو بھی کاٹ ڈالا اور ان کو بھی مار ڈالنے کے درپے ہوئے۔ وہ بمشکل جان بچا کر واپس آئے۔

حضرت عثمانؓ کی سفارت

حضور اکرم ﷺ نے سوچا کہ اب کون جائے اور ہمارا پیغام پہنچائے؟ آپ ﷺ نے اب کی بار حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمر! آپ جائیں اور مکہ والوں کو یہ پیغام دیں کہ ہم لوگ لڑنا نہیں چاہتے، ہمارا ارادہ تو صرف بیت اللہ کی زیارت کرنا ہے اور عمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ دوسرا پیغام ان کو یہ بھی دیجیے کہ تم لوگ لڑ لڑ کر اپنی بہت ساری قوت ضائع کر چکے، ایسا کیوں نہ کر لیں کہ ہم آپس میں ایک مقررہ مدت تک کے لئے صلح کر لیں۔ اس درمیان تم لوگوں کو بھی ذرا سانس لینے اور تیاری کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اور میرا معاملہ اس دوران دوسرے قبائل سے رہے گا۔ دوسرے قبائل والے اگر مجھ پر غالب آ گئے تو تمہارا مقصد یوں ہی مفت میں حاصل ہو جائے گا اور اگر میں غالب آ گیا تو پھر تم سوچ سکتے ہو کہ تم میرا ساتھ دو یا نہیں۔ جو کمزور مسلمان مکہ میں رہتے تھے اور اب تک ہجرت کر کے مدینہ نہیں پہنچ سکتے تھے ان کے نام بھی آپ نے پیغام دیا کہ ان کو بھی کہہ دیا جائے کہ اب زیادہ دن کی تاخیر نہیں ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب بہت جلد مکہ فتح ہونے والا ہے اور تمہاری مصیبت کے دن ختم ہوں گے۔ یہ تمام پیغامات لے

کر نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بھیجنا چاہا۔

حالات ایسے سنگین تھے کہ حضرت عمرؓ جیسا بہادر آدمی بھی سوچنے پر مجبور ہوا اور حضور اکرام ﷺ کی خدمت میں مشورہ پیش کیا کہ یا رسول اللہ! آپ جانتے ہیں کہ مکہ والے میرے کیسے دشمن ہیں۔ وہاں میرے قبیلے کا کوئی آدمی بھی نہیں ہے جو میری حمایت کرے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ حضرت عثمانؓ کو بھیجیں۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو بھی حضرت عمرؓ کی یہ رائے پسند آئی اور آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ اے عثمان! آپ چلے جائیں۔ حضرت عثمانؓ تیار ہو گئے اور یہ سب پیغامات لے کر مکہ والوں کے پاس جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ جب مکہ میں داخل ہونے کے قریب تھے تو ان کے قبیلے والوں کو پتہ چل گیا کہ حضرت عثمانؓ حضور اکرم ﷺ کا پیغام لے کر آ رہے ہیں۔ ان کے قبیلہ بنو امیہ کے لوگ مکہ میں رہتے تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ البتہ اس زمانے کے حالات کے مطابق قبائلی تعلقات رکھتے تھے اس لئے وہ تمام لوگ حضرت عثمانؓ کے استقبال کے لئے مکہ سے باہر آئے اور انہوں نے بڑے شاندار طریقے سے استقبال کیا اور ان کو اپنے ساتھ مکہ لے گئے۔ حضرت عثمانؓ اس طرح مکہ پہنچے اور حضور اکرم ﷺ کا پیغام مکہ کے بڑے بڑے سردار: ابوسفیان بن حزب، حویطب بن عبد العزیٰ، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابو جہل وغیرہ کے پاس پہنچایا۔

حضرت عثمانؓ کا حبِّ رسول

جب پیغام پہنچا کر کے فارغ ہوئے تو ان کے قبیلے والوں نے ہی حضرت

عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ آپ جب یہاں آ چکے ہیں اور بیت اللہ کے سامنے موجود ہیں تو آپ بیت اللہ کا طواف کر کے اور سعی کر کے اپنا احرام کھول دیں، آپ کے لئے تو کوئی روکاوٹ نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اللہ ہماری طرف سے جزائے خیر دے، ان کی محبتِ رسول پر قربان جایئے، ہم جیسا کوئی ہوتا تو جذبات میں وہی کر ڈالتا جو ان کے قبیلے والوں کی طرف سے کہا گیا؛ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام صحابہ کا کتنا خیال تھا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول کو اور صحابہ کو وہاں بیت اللہ کی زیارت کرنے سے روکا گیا ہے اور عثمان یہاں اکیلا بیت اللہ کا طواف کرے؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ نے انکار کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس انکار کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی بڑی ناگواری ہوئی کہ یہ عجیب آدمی ہے، ہم تو ان کی وجہ سے اتنی قربانی دے رہے ہیں اور ان کا ساتھ دے رہے ہیں اور یہ ہماری اتنی بات پر بھی توجہ نہیں کر رہے ہیں۔ غصہ میں آ کر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس جانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ اور بیعتِ رضوان۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس سبب سے واپس آنے میں دیر ہوئی تو اِدھر شیطان نے انسانی شکل میں آ کر یہ مشہور کرا دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ یہ بات مسلمانوں میں پھیلی تو مسلمانوں کو غصہ آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ایک کیکر کے درخت کے نیچے اس بات پر بیعت لی کہ: ہم جان دے دیں گے، لیکن کفار کا مقابلہ کریں گے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا بدلہ لیں گے۔ یہی

بیعتِ رضوان کہلاتی ہے۔ سورۂ فتح میں اسی بیعت کے متعلق یہ آیتیں نازل ہوئیں
لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ
کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین سے راضی ہوگیا کہ وہ نبی کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے ہیں۔ اس بیعت کو بیعتِ رضوان اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس بیعت پر اللہ کی طرف سے خوشنودی کا پروانہ دیا گیا تھا۔ جتنے بھی صحابہ کرام اس بیعت میں شریک ہوئے ہیں ان کے متعلق حدیث پاک (ترمذی، باب المناقب) میں جنت کی بشارت آئی ہے اور غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کے بعد نمبر دو پر ان صحابہ کا مقام اور درجہ سمجھا جاتا ہے۔ بعد میں خبر آئی کہ حضرت عثمانؓ شہید نہیں کئے گئے ہیں چنانچہ وہ صحیح سلامت واپس آئے۔

بدیل بن ورقہ کی سفارت

ابھی حضرت عثمانؓ وہیں مکہ میں تھے، واپس نہیں ہوئے تھے کہ قبیلہ خزاعہ کے ایک سردار بدیل ابن ورقہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ نے مکہ والوں کو یہی پیغام کہلوایا کہ تم ان سے جا کر کہو کہ ہم لڑنے کے واسطے نہیں آئے، اگر آپ صلح کرنا چاہیں تو ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بدیل بن ورقہ نے نبی کریم ﷺ کا یہ پیغام مکہ والوں کو پہنچایا۔

قریش کے مذاکرات کار: عروہ بن مسعود ثقفی

مکہ کے آس پاس جتنے قبائل تھے ان سے بھی قریش نے معاہدہ کر رکھا تھا اور

ان کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ قبیلۂ ثقیف طائف کا ایک قبیلہ تھا اور عروہ بن مسعود ثقفیؓ اس کے سردار تھے۔ یہ بعد میں مسلمان ہوئے مگر اس وقت مسلمان نہیں تھے، وہ اس موقع پر وہاں موجود تھے۔ جب بدیل بن ورقہ پیغام لے کر پہنچے تو عروہ بن مسعود ثقفی نے قریش سے یوں کہا کہ اے قریش! یہ بتلاؤ کہ میں تمہارے لئے باپ کی طرح اور تم میری اولاد کی طرح نہیں؟ انہوں نے کہا کہ یقیناً آپ ہمارے لئے باپ کے درجے میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم لوگوں کو میری خیر خواہی پر اطمینان نہیں؟ مجھ پر بھروسہ ہے یا نہیں؟ کہا کہ ہاں ہمیں آپ پر اعتماد ہے۔ انہوں نے کہا کہ تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں ان سے جا کر گفتگو کروں؟ تو کہا کہ ہاں! آپ جائیے۔ چنانچہ عروہ بن مسعود ثقفی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی غیرت ایمانی۔

واقعہ بڑا طویل ہے۔ اسی گفتگو میں ایک چیز یہ ہوئی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ نے کبھی سنا کہ کسی آدمی نے اپنی قوم کو ہلاک و برباد کیا ہو؟ آپ تو اپنی قوم کو ہلاک کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تو لڑنا نہیں چاہتا۔ میں تو لڑنے کے لئے آیا بھی نہیں۔ اگر یہ لوگ صلح کرنے کے لئے تیار ہوں تو میں آمادہ ہوں۔ اس وقت عروہ بن مسعود یہ بھی کہہ گئے کہ جب آپ پر کوئی مصیبت آئے گی تو مختلف قبائل کے جو لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہوئے ہیں وہ آپ کا ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ جملہ جب عروہ بن مسعود نے کہا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ

وہاں موجود تھے۔ان کو بڑا غصہ آیا اور انہوں نے عروہ کو گالی دے کر کہا کہ کیا کہا تم نے؟ کیا ہم حضور ﷺ کو چھوڑ دیں گے؟ عروہ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ ابوبکرؓ ہیں۔عروہ نے کہا کہ ان کا میرے اوپر ایک احسان ہے اور آج تک ان کے اس احسان کا بدلہ چکا نہیں سکا ہوں، اگر وہ نہ ہوتا تو میں ان کی بات کا جواب دیتا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی غیرت۔

خیر! اس گفتگو کے دوران عروہ بات کرتے کرتے حضور کی ڈاڑھی مبارک پر ہاتھ لگاتے تھے۔حضرت مغیرہ بن شعبہؓ وہاں کھڑے تھے، انہوں نے تلوار کا دستہ عروہ کے ہاتھ پر مارا اور یوں کہا کہ تم مشرک ہو، مشرک کا ہاتھ حضور ﷺ کی ڈاڑھی کے ساتھ نہیں لگ سکتا۔ ہاتھ ہٹاؤ۔مغیرہ بن شعبہؓ خود پہنے ہوئے تھے اور نظر نہیں آتے تھے۔عروہ نے پھر حضور سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ تمہارا بھتیجا ہے۔عروہ بن مسعود کو جب یہ معلوم ہوا تو کہا کہ اے غدار! تیری غداری کو تو بھگت رہا ہوں اور تو میرے ساتھ یہ سلوک کر رہا ہے۔

ہوا یہ تھا کہ مغیرہ بن شعبہؓ اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ مقوقس (مصر کے بادشاہ) کے دربار میں پہنچے تھے۔مقوقس نے سب کو انعام سے نوازا؛ لیکن ان کو کسی وجہ سے کم دیا، یہ چیز مغیرہ کو بڑی ناگوار ہوئی، واپسی کے وقت راستہ میں انہوں نے سب کو شراب پلائی اور جب سب شراب کے نشے میں مست ہو گئے تو سب کو قتل کر دیا اور مال لے کر کے مدینہ آئے اور وہاں اسلام کا اظہار کیا۔حضور

ﷺ نے انہیں صاف فرمادیا کہ دیکھو! یہ مال تو ہمیں منظور نہیں، یہ تم غلط طریقے سے لے کر آئے ہو۔ ہاں تمہارا اسلام ہمیں قبول ہے۔ خیر! ان کے قبیلے میں جب اس قتل کے واقعہ کے اطلاع ہوئی تو ساری دیت ان کے چچا عروہ کو ادا کرنی پڑی۔ اسی کو اس وقت عروہ نے کہا تھا کہ تمہاری غداری کو بھگت رہا ہوں۔

عروہ بن مسعود ثقفی کے تأثرات۔

حضرت عروہ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے جب واپس ہوئے تو جا کر کے قریش کو سارا حال سنایا اور یہ تمام منظر دیکھ کر کے یوں کہا کہ: اے قریش! میں بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں۔ کسی بادشاہ کے ہم نشینوں کو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس طرح سے محمد ﷺ کے ساتھی ان کے ساتھ کرتے ہیں۔

وہ جب کوئی بات کہتے ہیں اور کوئی حکم کرتے ہیں تو ان میں کا ہر شخص اس حکم کی بجا آوری کے لئے تیار رہتا ہے۔

وہ جب تھوکتے ہیں تو ان کا تھوک زمین پر گرنے کے بجائے ان میں سے کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے اور وہ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے چہرے پر مل لیتا ہے اور جس کے ہاتھ میں نہیں آتا ہے وہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ لگا کر کے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔

وہ جب وضو کرتے ہیں تو ان کے وضو کا گرا ہوا پانی لینے کے لئے آپس میں سبقت کرتے ہیں۔

اور جب وہ کوئی بات کہہ رہے ہوتے ہیں تو اس کو سننے کے لئے وہ سب ایسے خاموش اور متوجہ ہو جاتے ہیں جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔

آج تک میں نے کہیں نہیں دیکھا کہ کسی کے ہم نشین ایسی جاں نثاری سے پیش آتے ہوں۔ بہر حال! اس منظر نے عروہ کو بڑا متاثر کیا۔

صلح کی شرائط۔

قصہ مختصر یہ کہ صلح ہوئی اور اس میں ایسی ایسی شرائط طے کی گئیں کہ ان کو کوئی بھی سمجھ دار آدمی برداشت نہیں کرسکتا۔ مثلاً ایک شرط مکہ والوں نے یہ لگائی تھی کہ ہمارا کوئی آدمی مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ آئے گا تو اس کو واپس کرنا پڑے گا اور آپ کا کوئی آدمی مدینہ سے ہمارے یہاں آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ یہ شرط بھی لگائی کہ ابھی آپ مسجدِ حرام میں داخل نہیں ہو سکتے، اس سال تو آپ سب کو واپس جانا پڑے گا، آئندہ سال انہیں دنوں میں آنا ہوگا اور فقط تین دن تک قیام کریں گے، ساتھ میں ہتھیاروں کو نہیں لائیں گے۔ ایسی بہت سی یک طرفہ شرطیں تھیں۔ حضور نے یہ ساری شرطیں منظور کر لی اور صلح ہوگئی۔

شرائط صلح پر صحابہؓ کی ناگواری اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ

یہ شرطیں مسلمانوں کو بہت ناگوار ہوئیں۔ سب سوچنے لگے کہ ہم اس طرح دب کر کیوں صلح کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے سمجھ دار آدمی بھی اس کو برداشت نہ کر سکے۔ نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر

نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ہم حق پر اور وہ باطل پر ہیں۔

پوچھا کہ کیا ہم لڑیں اور ہم میں سے جو مارا جائے وہ جنت میں اور ان میں جو مارا جائے وہ جہنم میں نہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے۔

کیا آپ اللہ کے رسول نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ جی ہاں! ہوں۔

کیا آپ نے جو خواب دیکھا وہ سچا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ بالکل سچا ہے؛ لیکن اس کا مطلب یہ ضروری نہیں ہے کہ اسی سال وہ چیز حاصل ہوگی، خواب میں وقت تو نہیں بتلایا گیا تھا۔ خواب اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا۔

بہرحال! ایسی شرائط پر صلح ہوئی تھی کہ حضرت عمرؓ پر اور تمام صحابہ کرام پر بھی اس صلح کا بڑا اثر تھا۔ پھر بھی نبی کریم ﷺ نے اس صلح کو منظور فرمالیا اور شرط کے مطابق اس سال عمرہ کئے بغیر واپس ہونا منظور فرمالیا۔

شرائط صلح کا صحابہؓ پر اثر اور حضرت ام سلمہؓ کا مشورہ

صحابہ کرام پر اس کا اتنا زیادہ اثر تھا کہ جب یہ طے ہوگیا کہ اب عمرہ نہیں کرنا ہے اور نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے سر کے بال اتروا کر قربانی کے جانور ذبح کردو تو شدتِ اثر سے آپ ﷺ کے اس حکم کو سننے کے بعد بھی کوئی اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں۔ آپ نے دوسری مرتبہ فرمایا، پھر تیسری مرتبہ فرمایا؛ لیکن کوئی بھی نہیں اُٹھ رہا ہے۔

حضور ﷺ کو بڑا تعجب ہوا کہ میں حکم دے رہا ہوں اور کوئی سن ہی نہیں رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ آپ کو بڑا ناگوار معلوم ہوا۔ آپ خیمہ میں تشریف لائے۔ اس

سفر میں آپ کے ساتھ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ شریکِ سفر تھیں۔ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں نے ان لوگوں کو ایک حکم دیا لیکن کوئی اس کو بجا ہی نہیں لا رہا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ کو اللہ تعالی جزائے خیر دے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! حقیقت یہ ہے کہ اس صلح کی وجہ سے ان لوگوں کے دماغ ایسے ماؤف ہو گئے ہیں کہ آپ ان کو کیا حکم دے رہے ہیں اس کا انہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ ان کی طبیعتوں پر یہ صلح اتنی گراں گذر رہی ہے کہ وہ مبہوت ہیں۔ آپ کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہے۔ وہ مارے غم کے سن ہی نہیں رہے ہیں۔ اس لئے ان کو حکم دینے کے بجائے آپ خود اپنے سر کے بال صاف کرایئے اور اپنے ہدی کے جانور کو ذبح کیجیے۔ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ بال کاٹنے والے کو بلایا، انہوں نے حضور کے بال کاٹنے شروع کئے، صحابہ نے دیکھا کہ حضور ﷺ بال کٹوا رہے ہیں تو سب کے سب بال کٹوانے کے لئے ایسے پِل پڑے کہ معلوم ہوتا تھا کہ سر کاٹ لینگے۔

عمرۃ القضاء، قریش کی عہد شکنی اور فتحِ مکہ۔

قصہ مختصر صلح کے بعد سب واپس ہوئے اور دوسرے سال عمرہ کے لئے شرط کے مطابق مکہ آئے۔ چنانچہ سن ہجری ۷ میں عمرۃ القضا ہوا اور پھر قریش نے اس صلح کی خلاف ورزی کی، جس کے نتیجے میں پھر نبی کریم ﷺ مجبور ہوئے کہ آپ مکہ پر حملہ کریں۔ چنانچہ آپ سن ہجری ۸ میں رمضان المبارک میں مدینہ منورہ سے لشکر لے کر مکہ فتح کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔

اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے خاص اس کا اہتمام کیا تھا کہ مکہ والوں کو پتہ نہ چلنے پائے تا کہ مقابلہ کی نوبت نہ آئے اور اللہ کے حرم میں خون وخرابہ نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

زمانۂ صلح میں مسلمانوں کی حسنِ معاشرت

بہر حال! میں تو یہ کہنا چاہتا تھا اور جو چیز مجھے آپ کے سامنے پیش کرنی ہے وہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم ﷺ جن صحابہ کو ساتھ لے کر گئے تھے ان کی تعداد چودہ سو یا پندرہ سو تھی۔ اس کے دو سال بعد فتح مکہ کے موقع پر بلکہ ابھی دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، دو ماہ باقی تھے۔ اس وقت نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کی جس جماعت کو لے کر کے گئے اس کی تعداد ایک روایت کے مطابق دس ہزار اور ایک قول کے مطابق بارہ ہزار تھی۔ آج سے دو سال پہلے چودہ سو یا پندرہ سو کی تعداد تھی اب دس ہزار کی تھی۔ وہ چودہ سو، پندرہ سو وحی کے شروع کے زمانہ یعنی مکہ مکرمہ کے تیرہ سال اور چھے سال مدینہ منورہ کے کل انیس سال کے اندر آپ کے ساتھ جمع ہوئے تھے اور اب دو سال بھی پورے نہیں ہوئے ہیں کہ دس ہزار کی تعداد ہوگئی۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی؟

امام زہریؒ سیر و مغازی کے بڑے امام سمجھے جاتے ہیں اور صحاح ستہ کے راویوں میں کثرت سے محمد بن شہاب زہری کی روایتیں آتی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بات دراصل یہ تھی کہ اب تک تو آپس کی دشمنی کی وجہ سے قریش کی آنکھوں پر پردہ گرا ہوا تھا اور مسلمانوں کے اخلاق اور معاملات اور ان کی معاشرت کو جانچنے کا

ان کو موقع نہیں ملا تھا اس لئے ان کو اسلام کی خوبیوں کا پتہ نہیں چلا تھا اور وہ اسلام لانے سے باز رہے؛ لیکن جب صلح ہوگئی اور آپس کی روکاوٹیں دور ہوئیں۔ ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملا اور ایک دوسرے کے معاملات، اخلاق اور رہن سہن کو پرکھنے کا موقع ملا تو ان دو سالوں میں کفار پر مسلمانوں کی معاشرت، معاملات اور ان کے اخلاق کا بڑا اثر پڑا اور اتنی بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوئی کہ نبی کریم ﷺ دو سال پہلے چودہ سو یا پندرہ سو کو لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوئے تھے، آج دس ہزار کو لے کر جا رہے ہیں۔

تو بتلانا یہ چاہتا تھا کہ دیکھئے! مکہ کے دشمن کتنے بڑے دشمن تھے، کسی خوبی کو دیکھنے کو تیار نہیں تھے؛ لیکن وہ بھی مسلمانوں کی اس معاشرت کو، ان کے اخلاق کو اور ان کے معاملات کو دیکھ کر اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔ ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اس وقت مسلمان مصنفین نے بڑے اہتمام سے مستقل کتابیں لکھیں۔ جس میں یہ بتلایا گیا کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اخلاق سے پھیلا، اعمال اور معاشرت سے پھیلا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسلام حسنِ معاشرت سے پھیلا ہے۔

اسلام نے معاشرت، معاملات اور اخلاق کے بارے میں جو احکام اور آداب بتائے ہیں وہ ایسے ہیں کہ آج اگر ہم سب اسلامی معاشرت کو اختیار کرلیں، اسلامی معاملات کو اختیار کرلیں، اسلامی اخلاق کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں تو پاس پڑوس میں رہنے والا کوئی نہ ہوگا جو اس سے متاثر نہ ہو۔ بڑے سے بڑا دشمن بھی

اقرارکرنے پرمجبورہوگااوروہ اسلام میں داخل ہونے پرغورکرنے لگےگا۔

قیدیوں کےساتھ حسنِ سلوک۔

اسلام کے دشمن مدینہ منورہ پرحملہ کرنے کے لئےلشکرلےکرگئے تھے۔غزوۂ بدر کے موقع پر کفارِ مکہ ایک بڑا لشکر لے کر بڑی تیاری کے ساتھ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست ونابودکرنے اور مٹانے کے لئے چلے تھے،میدانِ بدر میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔اللہ تبارک وتعالی نے مسلمانوں کی مدد کے واسطے فرشتوں کا لشکر اتارا۔مسلمان کامیاب ہوئے اورمشرکین کےستر(۷۰) بڑے بڑے سرداراس جنگ میں مارے گئےاورستر(۷۰) قید میں پکڑے گئے۔ان جنگی قیدیوں کو لے کرحضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ آئے۔اس زمانے میں کوئی جیل خانہ تو تھانہیں۔صحابہ کرام میں انصار کے مختلف مکانات تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ قیدی صحابہؓ کے درمیان تقسیم کردیئے۔کسی کو ایک، کسی کو دو دیئے کہ ان کو اپنے پاس رکھو۔ان کی حفاظت کرو۔ویسے ان کو بیڑیاں پہنا کرگھروں میں رکھا گیا تھا؛لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی: استو صوا بالا سارٰی خیراً۔کہ ان قیدیوں کے معاملہ میں میری طرف سے بھلائی کی وصیت کوقبول کر لینا اورسن لینا۔ چنانچہ روایتوں میں آتاہے کہ جن صحابہؓ کے پاس یہ قیدی تھے،وہ صحابہؓ اپنے گھروں میں جوکھانا پکتاتھا وہ پہلے ان قیدیوں کوکھلاتے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ جوسابقین مہاجرین میں سے ہیں،ان کے بھائی بھی قیدیوں میں سے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ میں جن انصاری کے یہاں قیدتھاان لوگوں

کا حال یہ تھا کہ جب کھانا پکتا تھا تو پہلے مجھے کھلاتے تھے۔ وہ خود کھجور کھاتے تھے اور مجھے روٹی دیتے تھے، میں ان سے کہتا تھا کہ میں تو قیدی ہوں، کھجور پر اکتفا کر لوں گا، روٹی سالن وغیرہ آپ استعمال کیجیے۔ مجھے کھجور دے دیجیے۔ تو وہ کہتے کہ نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیں تاکید ہے کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ (معجم صغیر طبرانی، باب الحاء، من اسمہ حسین: ۴۱۰)

آپ اندازہ لگائیے کہ وہ لوگ جو جان کے دشمن تھے اور جو ان کو مٹانے کے لئے مکہ سے آئے تھے ان کو یہ لوگ پہلے کھانا کھلا رہے ہیں اور خود بھوکے رہتے ہیں۔ خود کھجوروں پر اکتفا کر رہے ہیں۔ وہ قیدی جو تلوار سے فتح نہیں ہوئے تھے، وہ اس اخلاقی خوبی اور حسنِ معاشرت سے فتح ہو گئے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اخلاق و معاشرت کی جو رہنمائی اسلام نے ہمیں عطا فرمائی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم اس کو اختیار کریں۔

نیو ورلڈ آرڈر کے اثرات۔

دیکھئے! آج کی دنیا میں اس وقت پورے عالم میں مسلمانوں کے اوپر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ اسلام کی دشمناوٹ میں امریکہ پیش پیش ہے اور یہ امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر (New World Order) کا منصوبہ خاص اسی لئے ہے کہ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جائے؛ لیکن اللہ تبارک وتعالی کی قدرت ہے کہ یہ لوگ اسلام کو مٹانے کے لئے جتنی کوشش کر رہے ہیں لوگ اور زیادہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی یہ حال ہے۔ بعض حضرات کا کہنا ہے

کہ یہ نیو ورلڈ آرڈر، جیو ورلڈ آرڈر کا ایک جز ہے۔ آج سے ایک زمانہ پہلے یہودیوں کے دانشور جمع ہوئے تھے اور انہوں نے ایک نظام بنایا تھا، جس کو پروٹوکول کا نام دیا تھا۔ یہودی دانشوروں اور حکمرانوں کے تیار کردہ پروٹوکول میں آئندہ کے لیے دنیا پر اپنا تسلط جمانے کے واسطے جو اصول وضع کئے تھے ان میں یہ بھی تھا کہ ہمارے لئے ضروری ہے اور بہت ضروری ہے کہ ہم اس بات کی کوشش کریں کہ ہر جگہ اخلاق دگرگوں ہو جائیں تاکہ ہم ہر جگہ پر غلبہ حاصل کریں۔ گویا یہودیوں کی یہ اسکیم ہے کہ پوری دنیا کے اندر ایسے حالات پیدا کئے جائیں اور ایسا نظام چلایا جائے کہ دنیا والوں کے اخلاق فاسد ہو جائیں۔ جب اخلاق بگڑ جائیں گے تو ان کا ماننا ہے کہ ہمارا غلبہ ہو جائے گا۔

آج کل امریکہ پر بھی یہودیوں کا تسلط ہے۔ جو سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ ہیں اور اخبارات سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ قوم دنیا میں قلیل تعداد میں ہے، لیکن اس کا پورا تسلط امریکہ پر ہے۔ دنیا میں جتنے اخبارات ہیں اور جتنے بھی ذرائع نشر و اشاعت ہیں چاہے وہ ریڈیو ہو یا ٹی وی ہو، جس قسم کا میڈیا ہو؛ ان پر پورا ان کا قبضہ ہے۔ وہ جو نظریہ چاہتے ہیں اس کو لوگوں کے اندر پھیلاتے ہیں اور ذہن سازی کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ نیو ورلڈ آرڈر اصل میں جیو ورلڈ آرڈر کا ایک جز ہی ہے۔ سمجھدار لوگوں کے کہنے کے مطابق یہ یہودیوں کی اسکیم کا ایک حصہ ہے اور امریکہ گویا اس کی کٹھ پتلی ہے۔ اور اسی ضمن میں ان کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق کو خراب کیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے حُسن وشراب کا جام۔

آج سے ایک مدت پہلے عیسائی مشینریوں کے ذمہ دار اور ان کے بڑے پوپ سب آپس میں ملے اور مشورہ ہوا۔ ایک پوپ نے اس میں یہ مشورہ دیا تھا کہ شراب کا ایک جام اور ایک حسین وجمیل لڑکی ملّتِ اسلامیہ اور امتِ محمدیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں وہ اثر دکھلاسکتی ہے جو ایک ہزار توپیں نہیں دکھلاسکتی۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ امتِ محمدیہ کے دلوں میں عورت کی شہوت، شراب کا نشہ اور عیش سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی محبت ڈال دو، اس کے لیے پوری کوشش کرو۔ آج یہی کوشش بڑے زور وشور سے ہو رہی ہے کہ مسلمانوں میں بلکہ یہودیوں کی کوشش تو یہ ہے کہ پورے عالم میں لوگ ایسی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوجائیں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں دین کو فاسد اور خراب کرنے والی ہیں، آدمی تعیش میں مبتلا ہوجائے اور ان سارے اسباب کو اختیار کرنے لگے تو پھر وہ دین پر قائم نہیں رہ سکتا۔

عیش پرستی؛ معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے۔

ایک اچھا آدمی اور افسر جو رشوت نہ لیتا ہو اور اپنے فریضہ کو پورا کرتا ہو اگر اس کو عیش میں ڈال دیا جائے اور وہ عیش پرستی کا عادی ہوجائے تو ظاہر ہے کہ اپنے اس عیش کو پورا کرنے کے لئے اس کو پیسوں کی ضرورت پڑے گی، پھر وہ پیسے حاصل کرنے کے لئے رشوت بھی لے گا اور سب کچھ کرے گا۔ آج تک جتنے بھی اصول اس کے پاس تھے وہ سب چھوڑ دے گا۔ اصولوں کا سودا کرنے کے لئے

تیار ہو جائے گا۔

آج کل ایک اسکیم کے تحت لوگوں کو ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ اسباب تعیش کی جانکاری فراہم کی جاتی ہے۔ جو لوگ ٹی وی دیکھنے والے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ عیش میں ڈالنے والی چیزوں کا اس کثرت سے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ آدمی کو اپنا معیارِ زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ فلاں چیز استعمال کرو اور فلاں چیز میں یہ فائدہ ہے۔ پیسے نہ ہونے کے باوجود جب آدمی اس کے استعمال کی خواہش کرے گا تو غلط راستے سے پیسے حاصل کرے گا۔ لڑکی ہوگی تو وہ اپنے آپ کو برائی کے لئے پیش کرے گی۔ اس کے پاس پیسے حاصل کرنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ والدین پیسے دیتے نہیں، اس لیے وہ اس راستہ سے پیسے حاصل کرے گی۔ مرد حضرات چوری کا، لوٹ کا اور بددیانتی کا راستہ اختیار کریں گے۔ اسبابِ عیش حاصل کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو کوشش کی ہی جائے گی۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے ذریعہ پورے عالم کے اخلاق کو بگاڑا جا رہا ہے۔ حقیقت میں یہ ان کی اسکیم ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو درست کریں۔ اور تعیش کے عادی نہ بنیں۔

یہود ونصاریٰ کا حسد اور فکری ومعاشرتی ارتداد کی کوششیں

میں نے ایک دوسری آیت آپ کے سامنے پڑھی تھی۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّاراً حَسَداً مِّنْ عِندِ

أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرة: ۱۰۹)

کہ بہت سے اہلِ کتاب دل سے اس بات کے متمنی ہیں کہ تم کو اسلام سے پھیر کر کفر میں لے جائیں۔

اہلِ کتاب کون ہیں؟ یہ یہود و نصاری ہیں۔ وہ لوگ دل سے اس بات کے متمنی ہیں کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے۔

کیوں؟ **حسداً من عند انفسهم**

یعنی وہ لوگ جانتے ہیں کہ اسلام مذہب برحق ہے؛ لیکن محض مسلمانوں کے ساتھ حسد اور عداوت کی وجہ سے وہ ایسا کرتے ہیں۔ ان کی یہ کوشش اس زمانے میں بھی تھی، جس کو قرآنِ پاک میں بتایا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہود و نصاری اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ جو لوگ اسلام میں آچکے ہیں ان کو اسلام سے برگشتہ کیا جائے۔

آج بھی کوششوں کا وہ سلسلہ جاری ہے۔ اسلام سے برگشتہ ہونا صرف یہی نہیں ہے کہ ایک آدمی یہ اعلان کر دے کہ میں اسلام سے ہاتھ دھوتا ہوں۔ نہیں! بلکہ اگر اس کے خیالات بدل جائیں، اس کے معاملات اسلام کے خلاف ہو جائیں، اس کے اخلاق غیر اسلامی ہو جائیں، اس کی معاشرت اسلام کے خلاف ہو جائے تو آپ بتلایئے کہ یہ معاشرتی ارتداد ہوگا یا نہیں؟ یعنی معاشرتی طور پر وہ اسلام سے ہٹا ہوا ہے، اخلاقی اعتبار سے اور معاملات کے اعتبار سے اسلام سے ہٹ گیا ہے تو پھر وہ عبادت کے اعتبار سے اسلام پر ہے بھی تو اس سے کیا فرق پڑتا

ہے؟ اصل تو اسلام کی قوت تو ان ساری چیزوں کے مجموعہ سے تھی۔ اب خالی عبادات میں مقررہ اوقات میں چند نمازوں کا اہتمام کر بھی لیتا ہے- اگر چہ یہ چیز بھی ضائع اور بیکار نہیں جائے گی، آخرت میں کام دے گی اور ایک وقت اس کو جنت میں ضرور لے جائے گی- لیکن اسلام کی جو اصل اسپرٹ ہے اور اصل قوت ہے وہ تو اسی وقت نمایاں ہوسکتی ہے جب اسلام کے سارے شعبے زندہ ہوں۔ عقائد کا پہلو بھی زندہ ہو، عبادت، معاشرت اور معاملات والا پہلو بھی زندہ ہو اور اخلاق والا پہلو بھی مسلمانوں کی زندگی میں ہو۔

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللهُ، الٹی ہوگئی سب تدبیریں۔

مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے ساتھ دنیا والوں کو بھی اسلام سے متنفر کرنے کے لیے اس وقت کتنی کوشش کی جارہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا، ابھی چند مہینہ پہلے اسلام کے نظامِ طلاق کے متعلق کتنا پروپگنڈہ کیا گیا۔ اسلام کے خلاف یہ پروپگنڈہ بہت پہلے سے کیا جارہا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے لئے کوئی حق نہیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام کے خلاف کتنا زیادہ پروپگنڈہ کرتے ہیں؛ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھیے کہ یہ سب ہو رہا ہے اور آپ نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ برطانیہ اور جرمنی میں عورتیں ہی کثرت سے اسلام قبول کر رہی ہیں۔ وہ لوگ جس چیز کو اسلام سے برگشتہ کرنے کا آلہ بنا رہے تھے اور اپنے پروپگنڈے کا خاص محور اور مرکز بنا رہے تھے اسی نقطے کو اللہ تعالی نے اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بنا دیا۔ وہ عورتیں جنہوں نے برطانیہ میں اسلام قبول کیا ان کی بڑی

تعداد ہے۔ جرمنی میں بھی بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی اور وہ بھی ان پڑھ نہیں، بلکہ پڑھی لکھی عورتیں اسلام قبول کر رہی ہیں۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ تم کو اسلام کی کون سی خوبی نے اسلام کی طرف مائل کیا اور کھینچا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ اسلام میں عورتوں کے متعلق جو احکام ہیں وہ بہت معتدل اور عورت کی فطرت کے مطابق ہیں۔ آج کل لوگ اسلام کے ان احکام کے ذریعہ جو عورتوں کے متعلق ہیں اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،لیکن اللہ تبارک و تعالی نے اس کا یہ اثر ظاہر فرمایا کہ بجائے اس کے کہ لوگ برگشتہ ہوتے ، اُلٹا لوگ اسلام میں داخل ہورہے ہیں۔

دل کی بے قراری کا علاج اسلام میں ہے۔

آج کی دنیا اتنی پریشان ہے کہ وہ اپنی اس بے چینی و بے قراری کو دور کرنے کے لئے چین وقرار کا کوئی سامان تلاش کر رہی ہے۔ اور وہ اسلام قبول کرنے کے واسطے بے چین ہے۔ موجودہ دنیا میں دل کی بیقراری کے ایسے ایسے سامان ہو چکے ہیں کہ ایک آدمی کے پاس دنیا کے عیش وآرام کے سارے اسباب موجود ہیں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اسبابِ عیش وآرام حاصل کرنے سے عیش وآرام حاصل نہیں ہوتا۔ آپ عمدہ سے عمدہ چارپائی لائیے، عمدہ سے عمدہ بستر تیار کیجیے۔ اس بستر پر پھولوں کی سیج بچھائیے اور اپنے مکان کو ایر کنڈیشنر سے ٹھنڈا کر دیجیے، پھر بھی نیند کی گارنٹی دی جاسکتی ہے؟ نیند نہیں آئے گی۔ نیند تو دوسرے اسباب سے آتی ہے۔ دل کے اندر ہی اگر آگ لگی ہوئی ہے تو مکان کو کتنا ہی ٹھنڈا کرو، دل کی آگ

ایر کنڈیشنر سے بجھتی نہیں ہے۔ دل کی آگ کو بجھانے کے لئے تو دوسرا طریقہ ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، قرآنِ پاک میں ارشادِ خداوندی ہے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان وسکون نصیب ہوا کرتا ہے۔ دل کی بے چینی و بیقراری اور دل میں لگی ہوئی آگ کو دور کرنے کا یہی ایک مجرب راستہ ہے۔

عملی اسلام کا نمونہ مطلوب ہے۔

بہر حال! آج کی دنیا بے قرار ہے، بے چین ہے، محتاجِ سکون ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی نمونہ پیش کیا جائے۔

ایک بات یاد رکھئے! ایک ماہر اقتصادیات ہے، ایکونومی (Economy) کا ماہر ہے اور وہ کوئی بڑا ہی عمدہ تجارت کا پروجیکٹ تیار کر کے کسی سرمایہ دار اور مالدار کے پاس جائے اور اس کے سامنے سارا فلسفہ پیش کرے کہ یہ کروگے تو یوں ہوگا اور اتنا بڑا نفع ہوگا، تو وہ پہلے یہ سوال کرے گا کہ اس کا کوئی عملی نمونہ موجود ہے؟ جب تک کہ اس کے سامنے عملی نمونہ پیش نہیں کیا جائے گا، وہ کبھی اپنی ایک پائی بھی اندر ڈالے گا نہیں۔ ہاں! اگر اس کو بتلایا جائے کہ دیکھو! فلاں جگہ اس فارمولا کو آزمایا گیا اور فلاں جگہ اس اسکیم پر عمل کیا گیا تو اتنے فیصد فائدہ ہوا تو پھر وہ وہاں سے باقاعدہ لیٹریچر منگوائے گا اور مطالعہ کرے گا اور جب اس کو یقین ہو جائے گا تو پھر وہ ایک لاکھ کیا دس لاکھ اور کروڑ بھی چاہو تو وہ دینے کے لئے تیار ہے۔ لیکن عملی نمونہ بتائے بغیر ایک پائی بھی دینے کے لئے راضی نہیں ہوگا۔

آج ہم اپنی طرف سے اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے کتنی ہی پیش کریں،

اس کی خوبیاں بیان کریں؛لیکن لوگ توعملی نمونہ چاہتے ہیں۔آج مجھ سے اورآپ سے کوئی یہ سوال کرے کہ پوری دنیامیں ایک پوراملک نہ سہی، پوراصوبہ نہ سہی، پورا شہرنہ سہی، پورا گاؤں نہ سہی ایک محلہ بتادو جواسلام کے بتلائے ہوئے نظام کے مطابق چلتا ہو،کیا ہم ہاں میں جواب دے سکتے ہیں؟ کیا ہم یہ جواب دے سکتے ہیں کہ فلاں ملک کے فلاں شہر کے فلاں محلہ میں آپ چلے جایئے، آپ کو وہاں اسلامی عقائد، اسلامی اعمال، اسلامی معاشرت، اسلامی اخلاق اور اسلامی معاملات کے یہ سارے نمونے دیکھنے ملیں گے؟ آج اگرایک محلہ بھی ہم ایسا پیش کردیں تو میں آپ کو گارنٹی سے کہتا ہوں کہ پوری دنیا اسلام کے سامنے سر جھکا دے گی؛لیکن ہمارے پاس ایک بھی نمونہ موجودنہیں۔

یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کرشرمائیں یہود۔

دنیاتونمونہ چاہتی ہے آج ہم جونمونہ دنیاکے سامنے پیش کررہے ہیں اس کو دیکھ کردنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے یہی اخلاق اسلامی اخلاق ہیں، ہماری یہی معاشرت اسلامی معاشرت ہے، ہمارے یہی معاملات اسلامی معاملات ہیں اور ان سب کودیکھ کروہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایسی ہی خراب تعلیم دیتاہے۔گویاہم لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔آج لوگ اسلام میں داخل ہوناچاہتے ہیں اورہم اسلام کے دروازے پرکھڑے ہوکراپنے معاملات واخلاق کے ذریعہ اوراپنی معاشرت بتاکرلوگوں کوروک رہے ہیں۔

لوگ یوں سوچتے ہیں کہ یہ اسلامی اخلاق ہیں؟اگراسی کا نام اسلامی اخلاق

ہے تو کون اس کو قبول کرے گا؟

گلۂ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

حال یہ ہے کہ ہم اسلام کے ساتھ محبت کا دعوی کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ اسلام پر جان نثار کرنے والے ہیں؛ لیکن اسلامی معاشرہ کا نمونہ پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ ایک فردِ واحد بھی ہے؟ جو دعوی کرسکے؟ جو لوگ اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں ان کے معاملات دیکھ لیجیے، ان کے اخلاق و معاشرت دیکھ لیجیے، لوگ نفرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین دار ایسے ہیں تو جو بے دین ہوں گے ان کا کیا حال ہوگا؟ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کے سامنے اسلام کا نمونہ پیش کیا جائے۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی لینن سے ملاقات

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نومسلم تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی تھی، 'تحریکِ ریشمی رومال' کے نام سے مشہور یہ آزادی کی ایک تحریک تھی۔ اس میں جو پیغامات ہوتے تھے وہ ریشم کے ایک کپڑے پر لکھے جاتے تھے اور اس کپڑے کو جہاں جہاں پیغامات پہنچانے ہوتے تھے وہاں پہنچایا جاتا تھا۔ اس لئے یہ تحریک 'تحریک ریشمی رومال' کے نام سے مشہور ہے۔ تحریک تو کامیاب نہیں ہوئی، پکڑی گئی، بھانڈا

پھوٹ گیا۔ مگر چونکہ اس تحریک میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ نے بڑا حصہ لیا تھا اس لئے ان کے خلاف انگریز کی طرف سے وارنٹ جاری ہوا۔ وہ اپنے آپ کو گرفتاری سے بچانے کے لئے انگریز کے دائرہ حکومت سے باہر روس چلے گئے۔ اس زمانے میں روس پر لینن یا اسٹالین برسرِ حکومت تھا اور چونکہ مولانا سیاسی پناہ گزیں تھے اس لئے لینن واسٹالین کے مہمان بنے اور ان ہی کے پاس قیصرِ صدارت میں رہنے لگے۔ یہاں ان کو لینن، اسٹالین اور دوسرے کمیونسٹ لیڈروں کے ساتھ گفتگو کرنے کا بھی موقع ملتا تھا۔

روسیوں کا کمیونزم اسی انگریزوں اور امریکیوں کے سرمایہ داری والے نظام کے خلاف متعارف کرایا گیا تھا۔ ان کے بقول ایسے گرے پڑے طبقات، جن کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا، ان کو اٹھانے کے لئے کمیونزم کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ بھی اب تو ناکام ہوچکی اور دنیا نے اس کی ناکامی بھی دیکھی، البتہ اس وقت اس کا بڑا زور تھا اور وہ تحریک بڑے عروج پر تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لینن کے سامنے اسلام کا پورا نظام پیش کیا اور اسٹالن کو دعوت دی کہ تم لوگ (یعنی کمیونسٹ پارٹی) اسلام قبول کرلو اور اسلامی نظام کو اپنے ملک میں نافذ کرو۔ کمیونزم کے بجائے اسلام کا نظام تمہاری تمناؤں اور مقاصد کو اچھی طرح سے پورا کرے گا۔ اس نے سب باتیں اور دلائل سنے، اس کے بعد لینن نے مولانا سے ایک سوال کیا کہ جو کچھ آپ نے بتایا وہ سب بالکل درست ہے، لیکن کیا اس کا کوئی نمونہ دنیا میں موجود ہے؟ آپ ہمیں عملی طور پر نمونہ بتلا سکتے ہیں؟ مولانا عبید اللہؒ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ خیر! لینن کا یہ سوال اخلاص پر مبنی تھا یا نہیں، یہ تو اللہ تعالی

بہتر جانتا ہے، لیکن اتنی بات تو طے ہے کہ اس کا نمونہ پیش کرنے سے ہم عاجز رہے۔ آج بھی ہمارے برادرانِ وطن میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اسلام کی تعلیمات سے وہ متأثر ہوئے اور وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ساری مشکلات کا حل اور سارے مصائب کا علاج اسلام میں موجود ہے، لیکن ان کی طرف سے یہی ایک سوال ہوتا ہے۔

اسلام عملی نظام کا نام ہے، نرا فلسفہ نہیں۔

میرے ایک دوست ہیں، عالم بھی ہیں اور تاجر بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک ہندو جس نے اسلام کا خوب مطالعہ کیا ہے اس نے میرے سامنے یہی سوال کیا کہ اسلامی تعلیمات فقط ایک فلسفہ ہے، یہ عملی چیز نہیں۔ اس نے یہ دعوی کے ساتھ کہا کہ یہ سب عملی طور پر ناممکن ہے۔ یہ تعلیمات عمل میں آ ہی نہیں سکتیں۔ یہ ایک بڑا عمدہ فلسفہ ہے؛ مگر اس کو عملی جامہ پہنانا مشکل ہے۔ اگر ایسا ہو تو ہمیں عملی نمونہ بتاؤ۔ اب تاریخ کے اوراق میں سے ہم اسے دکھائیں اور کہیں کہ قرنِ اول میں ایسے لوگ موجود تھے تو اس تاریخ پر کون اعتبار کرے گا؟ آج کل تو حال یہ ہے کہ اگر کہیں زندہ سلامت نمونہ موجود ہو تو جب تک کہ آنکھوں سے نہ دیکھیں وہاں تک یقین کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں، تو تاریخ کے اندر لکھی ہوئی باتوں پر کون اعتبار کرے گا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی معاشرت کو ایسا درست کریں کہ ہماری معاشرت، ہمارے اخلاق اور ہمارے معاملات دیکھ کر

لوگ اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں۔

اللہ کی مہلت سے فائدہ اٹھایئے۔

یاد رکھیے! برادرانِ وطن میں جو مذہبی جذبات ابھارے گئے ہیں وہ ہمارے لئے خیر ہی خیر ہے۔ شر کچھ بھی نہیں۔ آپ اللہ کا شکر ادا کیجیے کہ گذشتہ سال اسی تاریخ میں- آج تو دس دسمبر ہے نا؟- گذشتہ سال ۱۰ دسمبر کو یہاں سورت میں کیا حال تھا؟ اُس وقت جو حالات ہم پر گذر رہے تھے، ان سے یہ اندازہ ہم لگا سکتے تھے کہ اس طرح اطمینان سے بیٹھ کر ہم یہ سب باتیں کر سکیں گے؟ اس وقت ہم میں سے ہر ایک اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا کہ اس ملک میں اسلام کے لئے کوئی مستقبل موجود نہیں۔ ہم میں سے ہر شخص یہ سوچتا تھا کہ اسلام ختم ہو گیا سمجھو۔ مسلمان ختم ہو گئے؛ لیکن حالات نے کیسا پلٹا کھایا کہ وہی لوگ جنہوں نے یہ سب کرایا تھا، اقتدار کی کرسیوں سے ہٹائے گئے اور لوگ بھی ان کو لانے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ ان کو اور زیادہ اکثریت کے ساتھ آنا چاہیے تھا؛ لیکن نہیں آئے۔ یہ اللہ کی قدرت ہے۔

ابھی اللہ تبارک وتعالی کا دیا ہوا موقع ہمارے پاس باقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تو بڑی غلطیاں کی ہیں اور بڑی کوتاہیاں کی ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بار بار موقع دیا جاتا ہے، اب بھی موقع دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے تو **إن تتولوا يستبدل قوماً غيركم ثم لا يكونوا أمثالكم**، اگر تم راہِ حق سے ہٹو گے اور اس راہ کو اختیار نہیں کرو گے اور

تمام اسلامی احکام کو زندگی میں نہیں اتاروگے تو اللہ تعالیٰ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے دوسری قوم کو لائے گا اور وہ تمہاری طرح نہیں ہوگی۔ اللہ تعالی کی طرف سے یہ چیلنج پہلے سے دیا جا چکا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ کے کچھ مخصوص بندے ایسے ہیں جن کی دعاؤں کے صدقے ہمیں اور امت کو سنبھلنے کا موقع دیا جارہا ہے۔ لیکن کب تک؟

آپ سوچئے! باپ کا کوئی بیٹا نافرمانی پر اتر آیا ہو اور باپ سزا دینے کے لئے آمادہ ہے؛ لیکن اعزہ میں سے کوئی آیا کہ یہ بیٹا ہی ہے اس کو ذرا موقع دو، تو وہ کہے گا کہ چلو! تم کہتے ہو تو موقع دیتا ہوں؛ لیکن پھر دوسری تیسری بار نہیں سنبھلے گا تو چاہے جتنے لوگ سفارش کریں اور بار بار کریں ایک وقت آئے گا کہ باپ اس کو کان پکڑ کر گھر سے نکال دے گا اور کہہ دے گا کہ تو میرا بیٹا نہیں، میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

اللہ تعالی کی کسی کے ساتھ رشتہ داری نہیں۔

اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ ابھی ہم کو سنبھلنے کے مواقع دیے جارہے ہیں۔ ہمارے کان کھولنے کے لئے، ہماری نیند اُڑانے کے واسطے بہت جھنجھوڑا گیا اور بہت سخت سے سخت حالات ہم پر لائے گئے، اگر ہم نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا اور درست نہیں کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہمارے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ یہ یاد رکھیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سپہ سالار بنا کر بھیجا تھا اور

مسلمانوں کا لشکر دریائے دجلہ کو بغیر کشتیوں کے پار کر گیا تھا تو اس وقت کہا گیا تھا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کسی کے ساتھ لگائی اور رشتہ داری نہیں ہے۔ معلوم ہوا جیسے اعمال ہوں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو گندم از گندم بروید و جو ز جو

گیہوں بوؤ گے تو گیہوں ملیں گے اور جَو بوؤ گے تو جَو ملیں گے۔ اس لیے آدمی کو اپنے عمل کے بدلے سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ہم اگر کانٹے بوئیں گے تو کانٹے ہی ہمیں ہاتھ آئیں گے اور اگر ہم پھول اگائیں گے تو پھول ہاتھوں میں آسکتے ہیں۔ کانٹے بو کر ہم پھولوں کو حاصل کرنے کی امید رکھیں تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اعمال کو درست کریں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا۔

دوسری قوموں کو اپنے اخلاق و معاملات اور اپنی معاشرت کے ذریعہ دعوت دیں۔ زبان سے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زبان سے کہنا اتنا مفید نہیں گرچہ وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں؛ لیکن ہمارے اعمال سے ان کو جو دعوت پہنچے گی وہ ایسی پختہ اور قوی ہوگی کہ وہ اپنا سر جھکانے کے لئے مجبور ہوں گے۔ بس! میں اپنی بات کو ختم کرتا ہوں اور علامہ اقبال کا شعر پیش کرتا ہوں۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اگر ہم ان صفات کو اپنے اندر پیدا کریں گے تو دوبارہ وہی چیز حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ تو پھر اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے جو معاملہ ہو ہم اس کے مستحق قرار دیئے جائیں گے۔

اللہ تعالی ہم کو توفیق عطا فرمائے کہ دین کے سارے اجزاء کو اور تمام شعبوں کو ہم اپنی زندگی کے اندر اُتارنے کی کوشش کریں۔